راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے زیر اہتمام مسلسل اشاعت کا 18 واں سال

ماہنامہ

ارژنگ

لاہور

Monthly

Arxang

Lahore

مدیر اعلیٰ: عامر بن علی

مدیر: حسن عباسی

مئی 2016ء

پاکستان میں اردو عوامی سطح پر بھی اب وہ اردو نہیں ہے جو پچاس سال پہلے بولی اور لکھی جاتی تھی۔

ظفر اقبال سے عامر بن علی کی گفتگو

میں غلط ہو سکتا ہوں لیکن جسے میں صحیح سمجھتا ہوں اُسے ضرور کر گزرتا ہوں۔

عوامی زبان ادبی بنتی رہتی ہے اور ادبی عوامی۔

ارژنگ: ادبی سفر کا آغاز کیسے کیا ابتدا میں کن سے متاثر تھے۔؟

ظفر اقبال: میں اس وقت آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا جب میں نے دیوان غالب اور کلیات میر کا بیشتر حصہ پڑھ ڈالا تھا لیکن مجھے چونکہ پتہ تھا کہ میں نے کبھی جا کر شاعری کرنی ہے اور اگر یہ دونوں اساتذہ میرے زیر مطالعہ رہے تو میں ان کے اثر سے کبھی نہیں نکل سکوں گا۔ تو اس خدشے کے پیش نظر کلیات میر میں نے اپنے دوست سید اسرار زیدی کو دے دی جو ان دنوں اوکاڑہ ہی میں رہائش رکھتے تھے اور دیوان غالب (مصور چغتائی ایڈیشن) کوئی میرے ہاں سے اٹھا کر لے گیا جس پر میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اس کے علاوہ میرا نہیں خیال کہ میں کبھی کسی کی شاعری سے متاثر ہوا ہوں۔ یہی دو شاعر شروع شروع میں میرے زیر مطالعہ آئے تاہم لکھنے کا آغاز میں نے بہت بعد میں اس وقت شروع کیا جب میں گورنمنٹ کالج کا طالب علم تھا۔

ارژنگ: تو کیا آپ مطالعہ کی نفی کرتے ہیں؟

ظفر اقبال: میرا مطلب یہ ہے کہ ذہن پر اگر کوئی آدمی حاوی ہو جائے تو وہ اسی سے متاثر ہوتا ہے اس لیے میں نے اس خطرے کا ازالہ اس طرح کیا کہ ان دونوں اساتذہ کو وقتی طور پر اپنے آپ سے الگ کر لیا۔

ارژنگ: اوکاڑا سے نکل کر لاہور میں پہچان بنانے کے لیے آپ کو کیا پاپڑ بیلنے پڑے؟

ظفر اقبال: دراصل میری پہچان قیام اوکاڑا کے دوران ہی بن چکی تھی، لاہور تو میں ۱۹۹۵ء میں آیا تھا اور یہ مسئلہ مجھے درپیش نہیں تھا۔

ارژنگ: آپ ہر وقت بڑے،، موڈ،، میں نظر آتے ہیں۔ اسکی کوئی خاص وجہ ہے؟

ظفر اقبال: میں موڈ میں ہوتا ہی نہیں۔ کبھی بھی، بلکہ ساتھ بیٹھے دوستوں کے ساتھ حسب توفیق گپ شپ بھی کیا کرتا ہوں اور مجھے کبھی خیال نہیں ہوا کہ میں دوسروں سے الگ تھلگ غصے یا موڈ میں ہوتا ہوں نہ ہی میرا مزاج ایسا ہے۔ ہو سکتا ہے یہ بات صحیح ہو لیکن میں نے خود یہ بات کبھی محسوس نہیں کی نہ ہی یہ میری شعوری کوشش کا حصہ ہے۔

ارژنگ: آپ بیک وقت وکیل، کالم نگار اور شاعر ہیں، تین متضاد شعبوں میں خود کو برابر کیسے تقسیم کرتے ہیں؟

ظفر اقبال: مجھے ان میں ایسا کوئی تضاد نظر نہیں آتا اب تو میں اس بات کا عادی ہو گیا ہوں بلکہ وکالت میں تو کچھ چیزیں ایسی ہیں جنہوں نے مجھے مدد دی ہے۔ مثلاً وکالت میں منطق اس کا لازمی حصہ ہے جو دلائل دیتے وقت کام آتی ہے تو کالم لکھتے وقت بعض اوقات میں اس منطق سے بھی کام لیتا ہوں اور میں سمجھتا ہوں میرا کام آسان ہو جاتا ہے۔

ارژنگ: آپ کا کہنا ہے کہ کالم نگاری میں بھی آپ نے اپنی شاعری کی طرز پر اپنا وضع کردہ طریقہ اپنایا ہے؟

ظفر اقبال: میں کہوں گا کہ یہ میری اپنی ایجاد ہے اور بہت سے لوگوں نے اسکی نقل کرنے کی کوشش بھی کی لیکن میں سمجھتا ہوں وہ کامیاب نہیں ہوئے۔ فکاہیہ کالم میں، میں پیروڈی لکھنے کی بھی کوشش کرتا ہوں اور سرخیاں ان کی متن ہمارے بھی پیروڈی کی ہی ایک شکل ہے۔

ارژنگ: سرخیاں ان کی متن ہمارے تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ کیا، "نوائے وقت" کے کالم "سرراہے" ہی کی ایک شکل نہیں؟

ظفر اقبال: سرراہے کے ساتھ اس کا تقابل بالکل نہیں کیا جا سکتا وہ مختلف موضوعات پر ٹکڑوں میں کمنٹس ہوتے ہیں جب کہ "سرخیاں ان کی متن ہمارا" اس میں عام طور پر کسی سیاستدان کا بیان ہوتا ہے اور میں اس کو اپنی ٹریٹمنٹ دیتا ہوں اور یہ دکھانے کی کوشش کرتا ہوں کہ اس بیان کے اس حصے کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے یا اس کا مضحک پہلو یہ بھی نکل سکتا ہے۔ یا یہ کہ بیان دینے والے کے دل کے کسی گوشے میں یہ بات بھی ہو سکتی ہے جو اس کے بیان کے بظاہر کے بالکل برعکس ہی کیوں نہ ہو بہر حال کالم نویسی کو میں نے اپنی شناخت بنانے کی کوشش نہیں کی۔ یہ کام میں خود مزا لینے کی خاطر کرتا ہوں۔

ارژنگ: کالم نویسی ایسا سنجیدہ کام آپ صرف مزا لینے کے لیے کرتے ہیں؟

ظفر اقبال: میرا مطلب یہ ہے کہ لکھنے میں شاعری بہت سنجیدہ کام ہے میں اس سے بھی بہت لطف اندوز ہوتا ہوں ہر تخلیق کار اپنی تخلیق یا فن پارے سے بہت لطف اندوز بھی ہوتا ہے کیونکہ ایک جگہ میں نے پڑھا تھا کہ آپ کے لیے حقیقی مسرت یہ احساس ہے کہ آپ کسی کام میں مکمل طور پر (Competent) ہوں اور کرافٹ کے حوالے سے جب آپ محسوس کرتے ہیں بلکہ اپج کے حوالے سے بھی کہ آپ کی تخلیق وہ شعر ہو یا کالم ہو اس پر آپ کو ایک طرح کا عبور حاصل ہے تو لا محالہ اس احساس سے خوشی ہوتی ہے۔ اور یہ ضروری نہیں کہ وہ عبور آپ کو حقیقتاً حاصل بھی ہو بلکہ یہ احساس ہی کافی ہے کہ آپ کسی صنف کسی انداز کسی لہجے یا کسی اسلوب پر ایک طرح کی قدرت رکھتے ہیں

ارژنگ: کیا ہر شخص کے لیے اپنا الگ تجربہ ضروری ہے؟

ظفر اقبال: تجربہ جو میں نے کیا وہ شاعری کے حوالے سے کیا ہے اور ہر تجربہ آدمی اپنی کسی ضرورت یا مجبوری

بقیہ اندرونی صفحات

طنز و مزاح کے اکھاڑے میں لنگوٹ کس کے اُترنا اتنا آسان کام نہیں جتنا نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دیگر اصناف ادب کے برعکس بہت کم لوگوں نے اس صنف کے ساتھ پنجہ آزمائی کی کوشش کی۔ جو میدان میں اُترے اُن میں سے بھی بیشتر اس صنف کو پچھاڑنا تو در کنار اس کی "وینی" پکڑنے میں بھی کامیاب نہیں ہوئے اور اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ طنز و مزاح کے میدان میں شاعروں کی طرح لاکھوں کا مجمع نہیں ہے۔ بلکہ جو نیا دیوانہ آتا ہے جلد پہچانا جاتا ہے اور اُسے دیکھ کر خوشی بھی ہوتی ہے کہ آخر اس خارزار میں کسی نے تو قدم رکھا۔ حافظ مظفر محسن بھی ہمارے قبیلے کا ایک فرد لگتا ہے۔ وہ ایک جینوئن مزاح نگار ہے۔ ملاقات سے پہلے اخبارات کی ورق گردانی کرتے ہوئے کبھی کبھار مظفر محسن کی کوئی تحریر نظر سے گزر جاتی۔ وہ تحریر نہ تو مکمل طنز و مزاح کے زمرے میں آتی اور نہ ہی سنجیدہ نثر کے زمرے میں بلکہ ان دونوں کے مابین وکھری ٹائپ کی کوئی تحریر ہوتی۔ مظفر محسن سے جب دو چار ملاقاتیں ہوئیں تو اندازہ ہوا کہ وہ صرف شگفتہ نثر ہی نہیں لکھتا بلکہ طنزیہ جملوں کے تیر برساتا، شرارتیں اور چھیڑ خانیاں بھی کرتا ہے۔ حافظ مظفر محسن کی تحریر میں اُس کی شخصیت کے یہ پہلو جھلکتے ہیں۔ لہٰذا اُس کی تحریر پڑھ کر اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔ وہ روزمرہ کے واقعات کو موضوعِ سخن بناتا اور ہمارے اردگرد پھیلے کرداروں کو کٹہرے میں لاکھڑا کرتا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ان سے چھیڑ خانیاں اور مستیاں کر کے پھر اُن سب کو باعزت بری بھی کر دیتا ہے۔ حافظ مظفر محسن کو مزاح لکھنے کا حق اس لیے بھی حاصل ہے کہ اُس کے چہرے پر ایک دلکش مسکراہٹ ہر وقت پھیلی رہتی ہے جو کہ فی زمانہ کسی صدقہ جاریہ سے کم نہیں۔ مجھے یہ شخص پسند ہے کیونکہ وہ ایک سچا اور مخلص انسان ہی نہیں بلکہ ایک شگفتہ اور جینوئن مزاح نگار بھی ہے۔

عطاء الحق قاسمی

ممتاز ادیب اور مزاح نگار

حافظ مظفر محسن

کی طنز و مزاح پر مشتمل کتاب

"بونا نہیں بے وقوف"

کا چوتھا ایڈیشن شائع ہو گیا ہے

اپنی کتاب کی بہترین اشاعت کے لیے رابطہ کریں

نستعلیق Publications

غزنی سٹریٹ • اردو بازار • لاہور
0300-4489310 - 042-3751963
nastalique786@gmail.com

برطانیہ (نوٹنگھم) میں مقیم معروف شاعرہ، ناول نگار اور افسانہ نویس

سعدیہ سیٹھی

کی کتابیں

- کبھی ناراض مت ہونا (شعری مجموعہ)
- تنہائیاں (شعری مجموعہ)
- محبت آخری سچ ہے (ناول)
- پہیلیاں (بچوں کے لیے)

شائع ہو گئی ہیں

نستعلیق Publications

غزنی سٹریٹ • اردو بازار • لاہور
0300-4489310 - 042-3751963
nastalique786@gmail.com

ہر طرف گہرا دھواں ہے اور میں
اک نیا پھر امتحاں ہے اور میں

چاند ہیں حد نظر تک آنکھ کے
آنسوؤں کی کہکشاں ہے اور میں

رسم دُنیا کے تقاضے اور ہیں
کیا کروں کہ دل جواں ہے اور میں

لاکھ اندیشے کروڑوں وسوسے
جانے کیا سے کیا گماں ہے اور میں

آنچل اوڑھے چل رہی ہوں اس کے ساتھ
سر پہ بوڑھا آسماں ہے اور میں

موت ہی لگتی ہے اُمید بہار
زندگی بھر کی خزاں ہے اور میں

سامنا ہے پھر نئی اک جنگ کا
سعدیہ پھر خانداں ہے اور میں

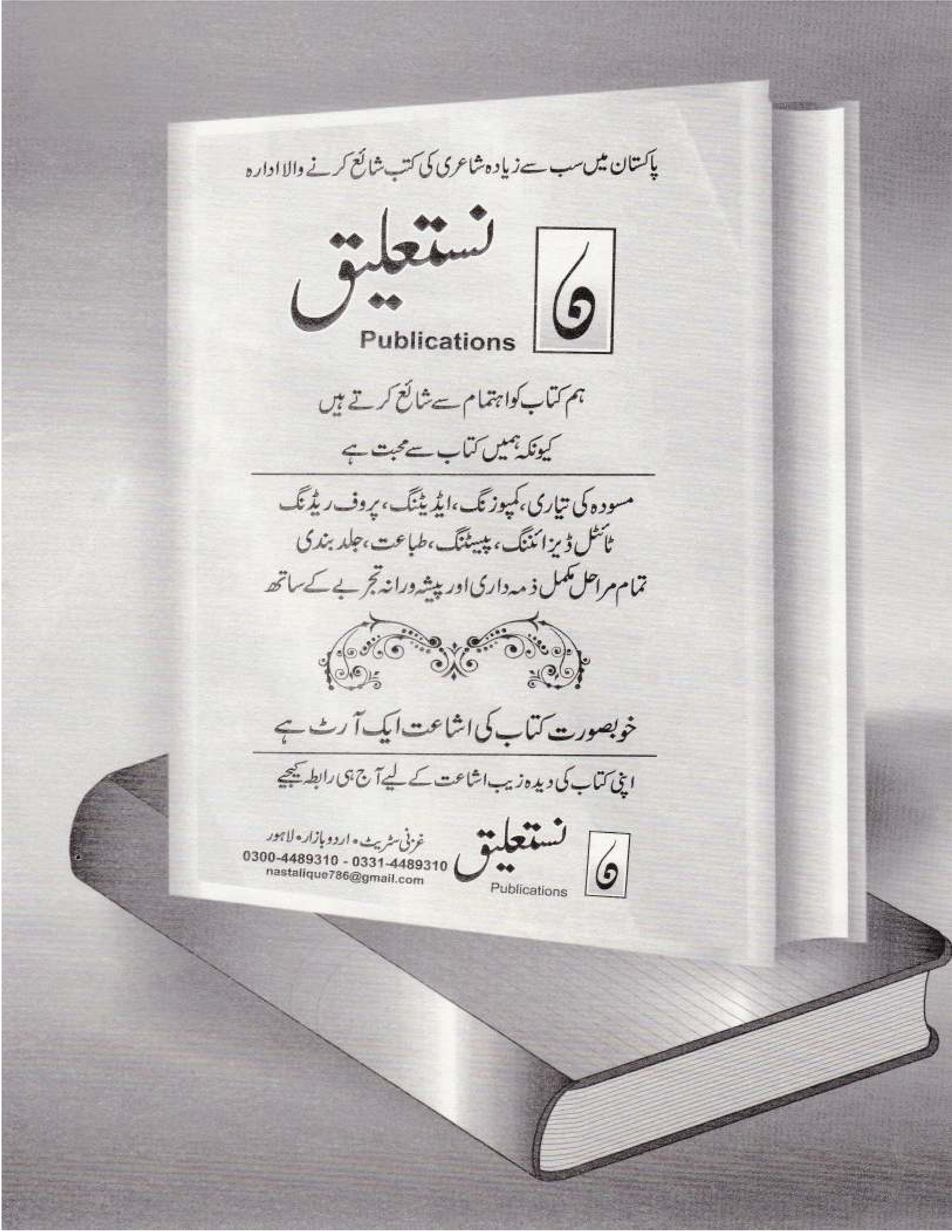

پاکستان میں سب سے زیادہ شاعری کی کتب شائع کرنے والا ادارہ
نستعلیق
Publications
ہم کتاب کو اہتمام سے شائع کرتے ہیں
کیونکہ ہمیں کتاب سے محبت ہے
مسودہ کی تیاری، کمپوزنگ، ایڈیٹنگ، پروف ریڈنگ
ٹائٹل ڈیزائننگ، پیسٹنگ، طباعت، جلد بندی
تمام مراحل مکمل ذمہ داری اور پیشہ ورانہ تجربے کے ساتھ
خوبصورت کتاب کی اشاعت ایک آرٹ ہے
اپنی کتاب کی دیدہ زیب اشاعت کے لیے آج ہی رابطہ کیجیے
نستعلیق
Publications
غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور
0300-4489310 - 0331-4489310
nastalique786@gmail.com

راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے زیر اہتمام مسلسل اشاعت کا 17 واں سال

Monthly
Arxang
Lahore

عالمی سطح پر اردو ادب کا ترجمان

ماہنامہ ارژنگ لاہور

جلد نمبر 18 • مئی 2016ء • شمارہ نمبر 5

مدیر اعلیٰ ⊛ عامر بن علی

مدیر ⊛ حسن عباسی

{مجلس ادارت}

ڈاکٹر صغرا صدف ⊛ ابرار ندیم ⊛ ڈاکٹر جعفر حسن مبارک

قمر ریاض (مسقط) ⊛ حافظ مظفر محسن ⊛ سعدیہ سیٹھی

{مجلس مشاورت}

محمود ظفر اقبال ہاشمی (سعودی عرب) ⊛ ظفر خان (آسٹریلیا) ⊛ ارشد نذیر ساحل (سپین)

محمد ادریس لاہوری (ناروے) ⊛ نازو کاظمی ⊛ لبنیٰ صفدر

مدیر منتظم ⊛ زاہد محمود شمس قانونی مشیر ⊛ افتخار شوکت چوہدری 0321-6012211

کمپوزنگ ⊛ زرتاب کمپوزنگ : 0321-4730769 فوٹوگرافر ⊛ نعمان حسن : 0333-4918383

آرٹ اینڈ گرافکس ⊛ محمد احسن گل : 0300-4529821

پتہ برائے خط کتابت

ماہنامہ ارژنگ

F-3 الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور

حسن عباسی : 0300-4489310 نازو کاظمی : 0301-4492133

nastalique786@gmail.com

سالانہ ممبرشپ

ڈاک خرچ (پاکستان) 1000 روپے • ڈاک خرچ بیرون ملک 5000 روپے

رابطہ : 0300-4489310 - 0331-4489310

فہرست

حمد و نعت/ حسن عباسی ' ۴

مضامین:

○ ہم تجھے سوچتے ہی جاتے ہیں...... کیپٹن عطا محمد خاں/ ڈاکٹر مختار احمد عزمی ' ۶

○ سید امجد علی شاہ مرحوم کی یاد میں / علی رضا ' ۸

○ شیدا پستول / مظہر اقبال کلیار ' ۹

طنز و مزاح: ○ کتاب دشمن ہٹلر سے ملاقات / حافظ مظفر محسن ' ۱۱

افسانے: ○ کج / نعمان منظور ' ۱۳

○ پہلی کرن / ارم زہراء ' ۱۶

○ انٹرویو / عائشہ مشعل ' ۱۸

○ "......باقی سب خیریت ہے" / راحسن سیموئیل ' ۲۰

○ جوگ آس / سمیرا احمد ' ۲۱

○ انعامی تصویر / دستگیر شہزاد ' ۲۸

○ پہلی کرن / ارم زہراء ' ۱۶

شاعری (غزل، نظم) ' ۲۹ تا ۳۴

آپ بیتی: ○ شام و سحر کے درمیاں (تیسری قسط) / رئیس عباس زیدی ' ۳۵

انشائیہ: گولے / محمد ممتاز راشد لاہوری ' ۳۸

شعری گوشے: جمیل قمر، نجمہ شاہین، ثمین سیف، جبار واصف، شفیق عطاری،

اسد علی باقی ' ۴۵

○ بقیہ انٹرویو/ ظفر اقبال ' ۴۶

○ بقیہ انٹرویو / ایوب صابر ' ۴۹

مختصر ادبی خبریں ' ۵۱

تبصرہ کتب ' ۵۴

نامہ ہائے احباب ' ۵۶

Far East Marketing Co.

Samaria Mansion 605 Koenji-Minami 1-6-5
Suginami-Ku, Tokyo, 166-0003 Japan
E-mail: femc1@hotmail.com

یوم مئی کی مناسبت سے علامہ اقبال کی

لازوال نظم ''خضرِ راہ'' کے دو بند

سرمایہ و محنت

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے
خضر کا پیغام کیا، ہے یہ پیامِ کائنات
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دارِ حیلہ گر
شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
دستِ دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی
اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات
ساحرِ الموط نے تجھ کو دیا برگِ حشیش
اور تُو اے بے خبر سمجھا اسے شاخِ نبات
نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ
خواجگی نے خوب چُن چُن کے بنائے مُسکرات
کٹ مرا ناداں خیالی دیوتاؤں کے لیے
سُکر کی لذت میں تُو لٹوا گیا نقدِ حیات

مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

اُٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دَور کا آغاز ہے

ہمتِ عالی تو دریا بھی نہیں کرتی قبول
غنچہ ساں غافل ترے دامن میں شبنم کب تلک

نغمۂ بیداریِ جمہور ہے سامانِ عیش
قصۂ خواب آورِ اسکندر و جم کب تلک

آفتابِ تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہُوا
آسماں! ڈُوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک

توڑ ڈالیں فطرتِ انساں نے زنجیریں تمام
دُوریِ جنّت سے روتی چشمِ آدم کب تلک

باغبانِ چارہ فرما سے یہ کہتی ہے بہار
زخمِ گُل کے واسطے تدبیرِ مرہم کب تلک!

کرمکِ ناداں! طوافِ شمع سے آزاد ہو
اپنی فطرت کے تجلّی زار میں آباد ہو

نہ میرے شہر نہ اس کائنات میں گم ہے
وہ اسمِ ذات جو اپنی صفات میں گم ہے
سمجھ سکے گی نہ ہرگز قدیم کا مطلب
جو مشتِ خاک سدا حادثات میں گم ہے
گناہ کرتا ہوں پھر خود ہی اُس پہ شرمندہ
کوئی تو ہے کہ جو اس واردات میں گم ہے
اسی کے امر سے پیدا ہوئی جہان میں موت
اسی کا حکم ہماری حیات میں گم ہے
وہ میری سوچ میں شامل نہیں ہے جس کی مثال
ہے اس کا ذکر جو ہر ایک بات میں گم ہے
اُجالتی ہے جو دن کو وہ روشنی فرخ
کسی کے گیسوئے رحمت کی رات میں گم ہے

فرخ راجا/راولپنڈی

دل ہے کعبہ میں جاں مدینے میں
مل گئی ہے اماں مدینے میں
رب نے چاہا تو جا کے دم لے گا
دل کا یہ کارواں مدینے میں
جس طرف دیکھیے نظر آئے
فصلِ گل کا سماں مدینے میں
خاکِ طیبہ جسے نصیب ہوئی
ہو گیا جاوداں مدینے میں
رحمتِ حق نے تان رکھا ہے
نور کا سائباں مدینے میں
اہلِ ایمان پر برستی ہے
رحمتِ بے کراں مدینے میں
اپنے کانوں سے میں سنوں خورشیدؔ
کاش جا کر اذاں مدینے میں

خورشید بیگ/میلسی

نبیوں کے سلطان محمدؐ
تجسیمِ قرآن محمدؐ
نکہت و نور کا سیلِ مسلسل
صبحوں کا ایقان محمدؐ
بے چینی کی ریگِ رواں میں
دل کا نخلستان محمدؐ
آپؐ کے عجز و خلق نے ڈھائے
نخوت کے ایوان محمدؐ
حسنِ عقیدت خاموشی کا
خوشبو کا الحان محمدؐ
آپؐ کے اک ایک نقشِ قدم پر
جان و دل قربان محمدؐ
مطلعِ جاں پر تابندہ ہیں
مثلِ مہِ فاران محمدؐ
آپؐ کے شہر میں بھول آئے ہم
اپنا نام و نشان محمدؐ
صبحِ ابد تک جاری رکھیں گے
رحمت کا فیضان محمدؐ
لفظوں کی تاثیر میں پنہاں
جذبوں کا عنوان محمدؐ
آپ کے نام سے وابستہ ہے
روح کا اطمینان محمدؐ
کیسے ہو بے بس حرفوں سے
آپ کی شان بیان محمدؐ
جو جیسا خوش فکر وہ ویسے
سیّد سوچ سلمان محمدؐ

غضنفر عباس سیّد/ساہیوال

کیسے کٹتے ہیں یہ دن رات مدینے والے
آپؐ پوچھیں تو بنے بات مدینے والے
اپنے اعمال کی شبنم کو ترستے دیکھا
اس پہ رحمت کی ہو برسات مدینے والے
میں جو خادم ہوں تو اولادِ ابی طالبؓ کا
یہ ہے اوقات میری ذات مدینے والے
ذکرِ احمدؐ سے دھڑکتا ہی رہے جس کا دل
اُس کو ہو کیسے بھلا مات مدینے والے
تو طلبگارِ مدینہ ہے تو سن لے مجیدؔ
حشر میں ہوں گے ترے ساتھ مدینے والے

عبدالمجید چٹھہ/لاہور

ہو اتنا مقدر مرا بالا شہِ والاؐ
دیکھوں میں ترے گھر کا اُجالا شہِ والاؐ
میں نے تجھے ہر سانس میں ڈھالا شہِ والاؐ
پہچان مری، تیرا حوالہ شہِ والاؐ
یکجا ہوئے جب کچھ مرے احباب جہاں بھی
بس میں نے ترا ذکر نکالا شہِ والاؐ
بس تیری ہی یادیں ہیں سراسر مرے دل میں
میں نے کوئی غم اور نہ پالا شہِ والاؐ

دل میں کوئی آزار سا ہی نہیں سکتا
ڈالا ہے ترے نام کا تالا شہِ والاً
انوار سماوی سے منور رہے تن من
ہو دور مرے چاند کا ہالا شہِ والاً
اللہ کا تھا حکم نہ دیکھے تجھے دشمن
مکڑی نے بُنا غار پہ جالا شہِ والاً
ڈوبا ہے ندیم آپ کی مدحت میں سراسر
نعتوں نے اسے خوب اُچھالا شہِ والاً
رقصاں ہے ندیم اب تری یادوں کے کھنور میں
یہ تجھ کو نہیں چھوڑنے والا شہِ والاً
ہے بہرِ ندیم اس سے بڑا اور شرف کیا
پہچان مری تیرا حوالہ شہِ والاً

ریاض ندیم نیازی/سبی

اُتر رہا ہے کوئی بار بار سانسوں میں
مہک رہا ہے رُخِ ذی وقار سانسوں میں
دھڑک رہا ہے دلوں میں خیالِ جانا نم
نفس نفس ہے مرا بے قرار سانسوں میں
فقط یہ سانس نہیں ہیں مری دلیلِ حیات
ہے ایک روح رواں برقرار سانسوں میں
مجھے قسم ہے، بلایا اگر نہیں مجھ کو
رُکا رہے گا دمِ اشکبار سانسوں میں
جہاں سے دیتے ہو پھولوں کو رنگ و بو آقا
اُتاریں مجھ پہ وہیں سے بہار سانسوں میں
وہ ایک سانس ہی کافی ہے تیری چاہت کی
بدونِ عشقِ نبیؐ صد ہزار سانسوں میں
کہاں ہے طاقتِ مدحت مری زباں کو مگر
رچا ہوا ہے محمدؐ کا پیار سانسوں میں

ڈاکٹر نادر علی شاہ

سکول، کالج، یونیورسٹی کے طلبہ اور ریسرچ سکالرز کے لیے ہماری چند کتب

مضامین پطرس	پطرس	140/- روپے
مضامین فرحت اللہ بیگ	مرتبہ: ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی	350/- روپے
جاڑے کی چاندنی	غلام عباس	200/- روپے
مراۃ العروس مع فرہنگ	ڈپٹی نذیر احمد	200/- روپے
اُردو تحقیق صورت حال اور تقاضے	ڈاکٹر معین الدین عقیل	700/- روپے
اُردو ادب کا ارتقاء	ڈاکٹر وحید قریشی	150/- روپے
اُردو تنقید (انتخاب مضامین)	پروفیسر اشتیاق احمد	700/- روپے
اُردو غزل (غزل کی دو سو سالہ تاریخ)	ڈاکٹر یوسف حسین خان	800/- روپے
مقدمہ شعر و شاعری	الطاف حسین حالی	200/- روپے
مقالات اقبال	عبدالواحد معینی	400/- روپے
تنقیدات تحسین فراقی	پروفیسر اشتیاق احمد	700 روپے
تنقید اور مجلسی تنقید	ڈاکٹر وزیر آغا	300/- روپے
تحقیق شناسی	ڈاکٹر رفاقت علی شاہد	500/- روپے
اصلاح تلفظ واملاء	طالب ہاشمی	250/- روپے
اُردو کے 25 افسانے	ڈاکٹر اورنگ زیب عالمگیر	500/- روپے
نیا افسانہ اور قاری	ڈاکٹر طاہر تونسوی	250/- روپے
ولی تحقیق و تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر محمد اشرف خان	250/- روپے
فیض احمد فیض (تنقیدی مطالعہ)	ڈاکٹر طاہر تونسوی	400/- روپے
داستان اقبال	آمنہ صدیقہ	200/- روپے

ناشر: **القمر انٹرپرائزز**، غزنی سٹریٹ اُردو بازار، لاہور 042-37237500

مولانا حامد علی خاں کی یاد میں شاہد علی خاں کی زیر ادارت شائع ہونے والا مجلہ

الحمراء

ادبی صحافت میں مقبولیت کے سنگ میل عبور کرتا ہوا گزشتہ پندرہ برس سے ہر ماہ باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے
اپنے ادبی ذوق کی تسکین کے لیے بک سٹال سے طلب فرمائیں یا ہم سے براہ راست منگوائیں

رابطہ کے لیے دفتر ماہنامہ الحمرا: j-24 ماڈل ٹاؤن، لاہور 0333-4001844

ہم تجھے سوچتے ہی جاتے ہیں......کیپٹن عطامحمد خاں

ڈاکٹر مختار احمد عزمی

حضرت احسان دانش نے لکھا ہے

"زندہ قومیں زندہ لوگوں کی قدر کرتی ہیں
مردہ قومیں مردوں کو پوجتی ہیں"(۱)

بلاشبہ ہم اپنے عظیم لوگوں پر عمر بھر سنگ زنی کرتے رہتے ہیں۔ ہاں مرنے کے بعد اعزاز کے ساتھ ضرور دفناتے ہیں۔ کاش ایسا ہو کہ ہم اپنے اچھے لوگوں کو اُن کی زندگی ہی میں سراہنے والے بن جائیں ورنہ ہماری کیفیت کچھ یوں ہوگی بقول سلیم احمد

ہم کو چاہا ہمارے بعد سلیمؔ
جیسے سوتے کو کوئی کر لے پیار

بہر حال میں کوشش کرتا ہوں کہ اپنے ارد گرد موجود لوگوں کے ٹیلنٹ سے آگہی حاصل کروں اور حتی الوسع انہیں بڑھاوا دوں۔ اس حوالے سے میرے مالک نے مجھے ایک ایسی آنکھ بھی عطا کی ہے جو مستقبل میں کچھ دور تک دیکھ لیتی ہے۔ کیپٹن (ر) عطا محمد خاں کو بھی میں نے بارہ سال پہلے دیکھا تھا۔

اس سے پہلے وہ ضلع رحیم یار خاں میں ڈپٹی کمشنر تھے۔ اسلام آباد، لاہور اور کراچی سے دور ڈپٹی کمشنر وغیرہ کا کافی رعب شعبہ ہوتا ہے لیکن پرویز مشرف کے بلدیاتی آرڈیننس 2000 نے DC کو DCO بنا دیا اور زیادہ وسیع اختیار منتخب چیئرمین ضلع کونسل کو دے دیے گئے۔ نئے اور بدلے ہوئے پیچیدہ حالات میں کیپٹن (ر) عطا محمد خان نے اپنے راجپوتی خون کو بڑی مشکل سے کنٹرول کیا اور ایک ایسے مخدوم کو "یس سر" کہنا قبول کیا جو چند ماہ پہلے انہیں "یس سر" کہتا تھا۔

اس سے پہلے وہ افغانستان کی زابل جیل میں بھی رہے جہاں ملا راکٹی نے انہیں یرغمال بنا رکھا تھا۔ آزمائش کا یہ زمانہ انہوں نے بڑی استقامت سے گزارا۔۔۔ وطن کی خدمت کرتے ہوئے اسیری کا اعزاز بھی کسی اور بیوروکریٹ کے حصے میں کم ہی آیا ہوگا۔ اس دورِ اسیری کا شعری اظہار "سرِ زنداں" کی صورت میں ہوا۔ شائع ہونے سے مجھے پہلے اس کا مسودہ دیکھنے کا موقع ملا تو میں نے جانا کہ عطا محمد خاں کی صورت میں مستقبل کا ایک بڑا شاعر چھپا ہوا ہے۔ اس دور میں میں نے لکھا

"عطا محمد خاں کے بارے میں پیش گوئی کرتے کے لیے نجومی ہونا ضروری نہیں۔ اس کی شاعری کا انگ انگ بول رہا ہے کہ وہ آگے چل کر ایک بڑا شاعر بنے گا۔"(۲)

اب جب کہ اُن کا تیسرا مجموعہ کلام منظر عام پر آ چکا ہے، ان کا ادبی قد و قامت بہت بڑھ چکا ہے۔ ملک کے نامور اہلِ قلم نے اُن کے فکر و فن کی داد دی ہے۔ وہ خوش قسمت ہے کہ اسے وافر محبتیں ملی ہیں۔

پہلے مجموعہ کلام "سرِ زنداں" کے کچھ منتخب اشعار دیکھیے۔

جو میرا نام عزت سے پکارا جا رہا ہے
یہ سب میرے نبیؐ کے فیض ہی کا سلسلہ ہے

....

سرکار دو جہاں کی حضوری مجھے ملے
سر خم ہو اور جھکی ہوئی گردن ہو اور میں

....

جھکنا پڑا عدو کو مرے سامنے عطاؔ
مشکل تھا مرے پاؤں میں زنجیر ڈالنا

....

زمین ہو کے ترا آسماں پہنتے ہیں
ہم اس جہان میں نیا اک جہاں پہنتے ہیں

میں راجپوت ہوں اور شاعری بھی کرتا ہوں
مرا کلام بھی خوش گماں پہنتے ہیں

....

اک شخص ساری رات جلا کر چراغ دل
سورج کو رکھ کے پاؤں تلے ناچتا رہا

....

ہم نے ہر ایک حرف کو بخشی ہے زندگی
ہم افسری میں شاعری کرتے رہے عطاؔ

عطا محمد خاں کی شاعری کے تیور دیکھتے ہوئے جو بات میں نے بارہ برس پہلے کہی تھی، اُس کی تائید معروف محقق اور نقاد ڈاکٹر سلیم اختر نے کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"یہ بھی حسنِ اتفاق ہے کہ کیپٹن (ر) عطا محمد خاں کے پہلے شعری مجموعے "سرِ زنداں" کے لیے قید محرک ثابت ہوئی۔"(۳)

اُردو کے زندانی اور حبسیاتی ادب میں "سرِ زنداں" ایک اہم اضافہ ہے۔ جس کے کئی اشعار زبان زدِ عام ہو چکے ہیں جیسے

مفلسی زمین بھوک آسمان ہے
ایشیا کے جسم پر سوالیہ نشان ہے

....

سب اُلٹا ہو رہا ہے تیری کائنات میں
بندہ یہاں خُدا ہے تیری کائنات میں

....

زندگی ختم ہو گئی لیکن
ہم تجھے سوچتے ہی جاتے ہیں

"بساطِ خواب" اُن کا دوسرا مجموعہ کلام ہے۔ اس میں وہ زنداں سے نکل کر باہر کی آزاد فضاؤں میں

سانس لیتے ہیں۔"سرِ زنداں" میں اُن کا جسم ضرور قید میں رہا لیکن روح آزاد تھی

اسیر قوموں کو اس بات کی خبر ہی نہیں
کہ زندہ قوموں میں کیا ہے مقام آزادی
دیئے سروں کے جلیں تو طلوع ہوتی ہے
اسیر قوموں کی قسمت میں شامِ آزادی

عطا کو الفاظ کے انتخاب کا سلیقہ عطائے خدا وندی ہے۔ نئی اور اچھوتی تراکیب اور تشبیہات ہما رے دامنِ دل کو بار بار کھینچتی ہیں۔ زخموں سے زخم جلانا ، رگِ زیتون پر دل کا کھلنا، صحرا کا دریا پہننا، فلک نما آنچل، ہوا کے ہاتھ میں تماشا بننا، موم کی موسیقی اور لبوں پر دیا جلانا وغیرہ

یہ دل ہے خانہ بدوشِ طلسم حیرانی
جہاں پہ رکتا ہو اس کو وہاں نہیں رکتا
ہم ہیں ورد زبان لوگوں کے
ایک میں اور میری رُسوائی

....

دونوں مجھ میں رہتے ہیں
میں اور میرا پاگل پن

....

خوب مشہور ہوئی شہر کے فرزانوں میں
عقل کے ہاتھ پہ رکھی ہوئی وحشت میری

"تکون" میں شامل کلام عطاء محمد خاں کے ارتقائی سفر کی نئی اور مزید نکھری ہوئی سطح ہے۔

کیا اور بھی ہے ماسوا دونوں کے اے خُدا؟
تو ہے، ترا عطا ہے، تیری کائنات میں

نامور شاعر گلزار نے عطاء کے بارے لکھا ہے

"پہلے ذکر سنا، پھر کلام پڑھا اور پہلے ہی شعر پر منہ سے بے ساختہ داد نکلی،

مری تمنا ہے کہ کسی دن لاہور جاؤں اور اُن سے ملوں۔"(۴)

یہ کائنات، یہ میں ہوں، یہ آپ ہیں صاحب
اسی تکون میں تینوں کہیں بندھے ہوئے ہیں

حمد و نعت، عطا کا محبوب موضوع ہے۔ جس کے لیے وہ اپنے فکر و فن کی بلندیوں کے ساتھ نادر لفظیات کا خراج پیش کرتے ہیں۔

ترے کرم سے اُڑے ہیں ترے سہارے پر
جہاں میں پھیل گئے چار سُو ہمارے پر
کبھی ہمیں بھی اٹھا روشنی کی لہروں سے
ہمارا نام بھی لکھ دے کسی ستارے پر

....

یہ روشنی و وقت بہت سست قدم ہیں
ہے تیز بہت توسنِ رفتارِ مدینہ

....

سبز گنبد کو واپس پلٹتے ہوئے
مُڑ کے پھر اک نظر دیکھنا چاہیے

....

گزر کر آئی ہے شہرِ نبیؐ سے
ہے خوشبو ہر طرف بادِ صبا کی

ہماری ذات سے کائنات تک کے دُکھ، عطا کے وہ موضوعات ہیں۔ جو "سرِ زنداں" اور "بساطِ خواب" میں ہیں لیکن "تکون" میں اُن کا آہنگ بلند ہو چکا ہے بقول سلیم احمد

کوئی کچھ بھی کہے پر سننے والا
وہ سنتا ہے جو سننا چاہتا ہے

عطاء کہتے ہیں:

کوئی سنتا نہیں کسی کی عطاء
شور اب بن گیا ہے سناٹا
پھر اس شہر کی نسلیں چلنے لگتی ہیں
ایٹم بم کے خوف جہاں در آتے ہیں
اے عطا وقت کے سمندر میں
آدمی نقش اب رکھے گئے
آئینے چیختے ہیں کہ ہر شخص نے یہاں
پتھر پہن لئے ہیں لبادہ اُتار کر

عطا کا رومانوی لہجہ متاثر کن ہے۔

میں نے چھوڑا نہیں ہے اس کا ہاتھ
اس کو دیکھا ہے پورے حسن کے ساتھ
لوٹ بھی آ کہیں پردیس میں جانے والے
ان لہو رنگ بہاروں کو ضرورت ہے تری

ہے عطاء کا یہی ایمان
آئی لو مائی پاکستان

کیپٹن (ر) عطا محمد خاں حمد، نعت، غزل، نظم، قطعات، ہائیکو میں فکر و فن کی نئی بلندیوں کو چھوتے ہیں۔ ان کا سفر ابھی جاری ہے۔ نامور دانشور عطاء الحق قاسمی کا یہ کہنا بجا ہے

"کیپٹن عطا ایک اچھا دوست، اعلیٰ انسان اور عمدہ شاعر ہے۔ میں اس کے جملہ اوصاف کا معترف ہوں۔ اُس نے کم لکھا، اچھا لکھا اور اپنا لکھا۔ اس کی رومانوی شاعری ہو یا انقلابی شاعری، وہ کہیں بھی آپے سے باہر نہیں ہوتا۔"(۵)

اُس کے دیگر مجموعہ ہائے کلام دل صحرا کی شام، آغوش، رنگ رساں تو یل اور گیت ہتاں دی پونی، منتظرِ اشاعت ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ "عطا کی شاعری" پر صدف قیوم ایم اردو سکالر نے ایک جامع اور مستند مقالہ تحریر کیا ہے۔ اللہ کرے کہ علمی دوستی کا سفر جاری رہے۔ روز ہم ملتے رہیں اور تشنگی باقی رہے۔

(۲۰۰۳ء/۲۰۱۵ء)

<u>حوالہ وحواشی</u>:(۱) احسان دانش، (۱۹۷۲ء) "جہانِ دانش"، لاہور، مکتبہ دانش انار کلی۔ (۲) روزنامہ "ایاسین" رحیم یار خاں ۳۰ اگست ۲۰۰۳ء (۳) سلیم اختر ، ڈاکٹر (۲۰۰۴ء) "سرِ زنداں کا جائزہ" فلیپ، لاہور ، کائنات پبلیشرز (۴) گلزار، (۲۰۱۵ء) فلیپ "تکون"، لاہور، ماورا پبلیشرز ۵) قاسمی، عطاء الحق (۲۰۱۵ء) فلیپ "تکون" لاہور، ماورا پبلیشرز

سید امجد علی شاہ مرحوم کی یاد میں

علی رضا

دنیا میں آنے والے ہر شخص کو مقرر اور متعین وقت پر یہاں سے رُخصت ہونا ہے اور اس مقام پر پہنچنا ہے جس کا وجود دائمی حیثیت رکھتا ہے جہاں کے اصول اور ضابطے اس عارضی اور ناپائیدار دنیا سے یکسر مختلف اور علیحدہ ہیں۔ اُس جہان میں تو ہر عمل انصاف کے ترازو میں تولا جاتا ہے۔ جس نے دنیا میں اللہ تعالیٰ کی مرضی سے زندگی بسر کی ہوگی اور اس کے احکامات کی بجا آوری اور پاسداری کا پابند رہا ہوگا وہ وہاں کامیاب و کامران ٹھہرے گا اور جو شخص عیش و عشرت اور دنیا کی آسائشوں کا اسیر رہا ہوگا اس کے لیے معاملے کی نوعیت کچھ اور ہوگی۔ بہر حال وہاں اللہ کے متقی اور پرہیزگار بندوں کے لیے امان ہی امان ہے۔

سید امجد علی شاہ کا شمار بھی ایسے ہی برگزیدہ اور نیک طینت بندوں میں ہوتا تھا جنھیں اللہ کریم نے اپنے مقرب اور نیک لوگوں کی صف میں شامل رکھا اور ان سے خیر کو پھیلانے اور اعمال صالح کی ترویج کا کام لیا۔

شخصی اوصاف سے مالا مال میرے بے حد محترم اُستاد اور نہایت شفیق انسان سید امجد علی شاہ گزشتہ دنوں اس عارضی دنیا سے ابدی جہان کی طرف رُخصت ہو گئے۔ عشقِ نبیؐ میں اُن کی آنکھیں ہمہ وقت نم رہتیں۔ جب بہت برس پہلے گورنمنٹ ہائی سکول ساہیوال میں جماعت ششم میں میرا داخلہ ہوا تو یہ نورانی چہرے والی شخصیت میری نظروں کا محور و مرکز بن گئی۔ تھوڑے ہی عرصہ میں ان کی دیگر خوبیاں بھی مجھ پر منکشف ہونے لگیں۔ وہ ایک فرض شناس اُستاد تو تھے ہی، سکول کی بزمِ ادب کے بھی انچارج تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ مدحتِ سرکارؐ کی سرشاریوں اور روحانیت کے والہانہ پن کے خوب صورت اظہار کا حصول مجھے اس سیّد زادے کی قربت کی وجہ سے ممکن ہوا۔ میں نے اُن کے فیضانِ نظر سے بہت کچھ پایا "چہرہ وہ نور بار مجھے بھولتا نہیں۔"

خوش خلقی اور حسنِ کلام جیسی خصوصیات سے لبریز شخصیت کے مالک اُستادِ محترم سید امجد علی شاہ کے سانحۂ ارتحال کے صدمے سے دل ابھی تک نڈھال ہے اور کسی طور بھی سنبھل نہیں رہا۔ غم و اندوہ کی مختلف کیفیات نے ذہن و دل کو بری طرح اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔ حیرت زدہ ہوں کہ ایسی انمول اور باکمال شخصیات بھی داغِ مفارقت دے جاتی ہیں جن کی یادوں سے دلوں میں خوشبوؤں کا ٹھکانہ ہو اور جن کی مہک سے مشامِ جاں معطر ہوں اور جن کی شخصیت اور اُن کی باتوں کی روشنی سے فضا مستنیر اور منور ہو۔

سید امجد علی شاہ مرحوم خاندانِ سادات کے وہ چشم و چراغ تھے جنھوں نے اپنی سیادت کو خوب نبھایا۔ انھوں نے عینِ شباب میں کردار کی پاکیزگی اور پاک دامنی کو اپنی شناخت بنایا اور پھر اس کے بھرم کو قائم بھی رکھا۔ وہ طویل عرصہ تک درس و تدریس کے مقدس پیشے سے وابستہ رہے اور اپنے تمام عرصہ ملازمت میں نہایت خوش اسلوبی اور دیانت داری سے اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داریاں ادا کرتے رہے وہ ہر وقت خوشبوؤں میں بسے رہنے والے انسان تھے جن کی شیرینی گفتار اور عظمتِ کردار کا ہر کوئی گرویدہ اور معترف تھا۔

مجھے گورنمنٹ ہائی سکول ساہیوال کے زمانہ طالب علمی کے دوران مختلف کلاسوں میں اُن سے کسبِ فیض کرنے کے بے شمار مواقع میسر آئے۔ سبحان اللہ! کیا خوب صورت اور مرنجاں مرنج شخصیت تھی اُن کی۔ کلاس میں پیریڈ کے دوران جب وہ گفتگو کرتے تو یوں محسوس ہوتا جیسے ان کے لبوں سے پھول جھڑ رہے ہوں۔ عام میں بھی وہ اپنے ملنے والوں کو اخلاقیات کا درس دینے کے ساتھ ساتھ نہ صرف اُن کی روحانی تربیت کرتے بلکہ اُنھیں اچھی زندگی گزارنے کے کامیاب اصولوں سے بھی آگاہ کرتے۔

سکول میں انچارج بزمِ ادب کے طور پر انھوں نے نعت خوانی کے حوالے سے میری بے حد رہنمائی فرمائی بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مجھے نعت خوانی میں جو گداز اور رچاؤ عطا ہوا یہ قبلہ شاہ صاحب کی صحبتِ صالح ہی کا فیض ہے۔ سکول کے طلبہ کے جمِ غفیر سے نکال کر میری تراش خراش اور فنی تربیت کا سہرا اُنھیں کے سر ہے آج اگر مجھے بین الاقوامی سطح پر نعت خوانی کے شعبے میں پذیرائی حاصل ہے تو اس کا کریڈٹ بلاشبہ استادِ محترم قبلہ شاہ صاحب کو جاتا ہے۔

وہ ایک باعمل اور تہجد گزار انسان تھے جنھوں نے تمام عمر ایک سچے مسلمان کی طرح بسر کی اور خلقِ خدا کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آتے رہے۔ غریبوں اور ناداروں کی مالی اعانت بھی کرتے اور اُن کی غمی خوشی میں دامے درمے سخنے شامل ہوتے سچی بات تو یہ ہے کہ وہ روشنی کا ایسا مینار تھے جنھوں نے تمام عمر معاشرے میں پھیلی ہوئی نفرت کی تاریک راہوں میں محبتوں اور اپنائیت کے چراغ روشن کیے۔ استادِ محترم قبلہ سید امجد علی شاہ مرحوم وہ خوش قسمت انسان تھے جنھوں نے اپنی دنیاوی زندگی بھی بڑے بھرپور انداز میں گزاری اور یقیناً آخرت میں بھی اُن کا شمار اللہ رب العزت کے مقرب لوگوں میں ہوگا۔ انھیں لوگوں میں جن کے لیے آخرت میں بہت سے انعامات اور نعمتیں رکھی گئی ہیں۔

مجھ ناچیز پر اُن کے احسانات اور شفقتوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ آج میں جس مقام پر ہوں اور جو کچھ بھی ہوں اُستادِ محترم کے قدموں میں بیٹھنے کی وجہ سے ہوں۔ میری تمام کامیابیوں کے پیچھے میرے والدین مرحومین کے علاوہ سید امجد علی شاہ صاحب جیسی شفیق ہستی ہی کی دعاؤں کا عمل دخل ہے۔

شاہ صاحب کی خوش کن یادیں میری زندگی کا اثاثہ ہیں۔ ان کی فیض رساں شخصیت کا تصور نور و نکہت کا ہالہ بن کر میرے چہار سو پھیلا ہوا ہے۔ آخر میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا ہے کہ وہ ہمارے اندر بھی قبلہ شاہ صاحب جیسی صفات پیدا کر دے تاکہ ہم بھی دنیا و آخرت کے امتحان اور معاملات میں کامیاب و سرخرو ہو سکیں۔

موت اُس کی ہے کرے جس کا زمانہ افسوس
یوں تو دنیا میں سبھی آئے ہیں مرنے کے لیے

شیدا پستول

مظہر اقبال کلیار/لاہور

مظہر کلیار یونیورسٹی آف ایجوکیشن لاہور سے اُردو زبان و ادب میں پی ایچ ڈی کر رہے ہیں۔ اُن کے ایم فل کے مقالہ کا عنوان ''عطاء الحق قاسمی کے مزاحیہ کرداروں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ'' ہے۔ جسے اُردو ادب کے اساتذہ اور طالب علموں میں کافی سراہا گیا۔ اُن کی ادبی تحریریں وقتاً فوقتاً مختلف رسائل میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ ماہنامہ ''ارژنگ'' میں عطاء الحق قاسمی کے مزاحیہ کرداروں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ کے عنوان سے ان کی تحریروں پر مشتمل سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے اُمید ہے قارئین اسے پسند کریں گے۔

انگریز کے ہندوستان میں وارد ہونے کے بعد سے ہمارے معاشرے میں ''دو طبقات'' نے جنم لیا، ایک وہ لوگ جو اپنی تہذیب و تمدن سے جڑا رہنا چاہتے تھے اور دوسرے وہ جنھوں نے مغربی رنگ و روپ کو اپنانا پسند کیا۔

کچھ کو ماضی گزیدہ کہا گیا اور تو کچھ کالے اور کالے انگریز کہلائے۔ اہلیانِ لکھنؤ اور دہلی نے مغربی طور طریقے اپنانے میں کافی وقت لیا۔ ''اودھ پنچ'' کے لکھنے والوں، خصوصاً اکبر الہ آبادی نے نئے انداز و اطوار کی کھل کر مخالفت کی۔ جبکہ سرسید احمد خان پہناوے سے زیادہ مغربی علوم و فنون کو اپنانے پر زور دیتے رہے۔ کسی بھی معاملے میں میانہ روی کا اصول بہت موثر اور کارآمد رہا ہے۔ اس لحاظ سے جدید علوم و فنون کے اختیار کرنے کے معاملے میں ''سرسیدی فکر'' کو ہر زمانے نے خراجِ تحسین پیش کیا گیا مگر حد سے زیادہ جدت پسندی اور خود نمائی نے ایک ایسا طبقہ بھی پیدا کر دیا ہے جو جدید علوم و فنون میں ہر لحاظ سے یکتا تو نہیں ہے۔ لیکن تہذیب و تمدن میں ''انگریزی'' طور طریقوں ہی کو اصل تہذیب کا نام دیتا ہے۔ ان کے انداز و اطوار سے مصنوعی پن کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ ان انداز و اطوار سے نابلد لوگوں کو اجڈ، گنوار، جبکہ ان کے مخالف ان کو ''کالے اور کاٹھے انگریز'' کا لقب دیتے ہیں۔

شیدا پستول کا کردار ''کلچرڈ طبقہ'' کے متضاد معانی و مفہوم میں پیش کیا گیا ہے:

''ہم لوگ بہت ''کلچرڈ'' ہو گئے ہیں۔ چائے پیتے ہوئے ہلکی سی آواز بھی پیدا نہیں ہونے دیتے۔ خواہ لب ہی کیوں نہ جل جائیں۔ کسی اعلیٰ درجے کے ریستوران میں بیٹھے ہوئے کچھ اس طرح سرگوشیوں میں گفتگو کرتے ہیں۔ جیسے سازش کر رہے ہوں۔ بات بات پر ''ایکسکیوزمی'' کہتے ہیں۔ کھانے کے بعد خلال کرنے کے لیے ایک ہاتھ سے منہ ڈھانپ کر دوسرے ہاتھ سے خلال کرتے ہیں۔ کہ کہیں نامناسب طریقے پر دانتوں کی نمائش نہ ہو جائے۔ کسی محفل میں کوئی اچھا سا لطیفہ سن کر ہنسنے کی نوبت آ جائے تو ''گیئر'' بدل بدل کر ہنستے ہیں۔''(۱۱)

مصنف نے ہمارے مصنوعی رہن سہن کا بڑے شگفتہ انداز میں نقشہ کھینچا ہے۔ کہ ہم ایک معاشرے میں دو مختلف تہذیبوں کے ساتھ زندہ رہ رہے ہیں۔

ہم میں سے کچھ لوگ ''تہذیب'' کے نام پر گھٹن کا شکار ہیں۔ جو نہ تو جی بھر کر خوشی کا اظہار کر پاتے ہیں اور نہ ہی اپنی کسی کیفیت کو دوسروں پر آشکار۔ اپنے آپ کو ''خواص'' کا درجہ دینے والے یہ لوگ ''معتبری'' کے نام سے جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔ ان کے انداز و اطوار میں مغربی تہذیبی عنصر اس حد تک داخل ہو چکا ہوتا ہے کہ یہ مشرق میں رہ کر مغرب میں جی رہے ہوتے ہیں۔ یہ اگر مقامی زبان میں بھی بات چیت کر رہے ہوں تو ان کا لب و لہجہ ''انگریزی'' ہوتا ہے۔

دوسرا طبقہ جو عوام کہلاتا ہے۔ اُس خاص قسم کی مغربی تہذیب سے دور، محدود وسائل میں زندگی کو زندہ دلی سے گزارنے والے لوگ ''شیدا پستول'' کی بھائی برادری کے لوگ ہیں اس تہذیب میں جینے والے قدرتی انداز و اطوار کے مالک طبقہ کے شب و روز کی کہانی مصنف ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

''کہ یہ لوگ کھانے کے بعد بھرپور طریقے سے ڈکار مارتے ہیں اور مزید ستم یہ کہ ایسے موقع پر پوری ڈھٹائی سے ''الحمدللہ'' بھی کہتے ہیں۔ بابو ہوٹل میں جا کر بیٹھتے ہیں۔ جہاں پورے زور سے ریکارڈنگ ہو رہی ہوتی ہے۔ اور اس سے زیادہ بلند آواز میں یہ لوگ باتیں کرتے ہیں اور قہقہے لگاتے ہیں، مشاعرے میں جاتے ہیں کھل کر داد دیتے ہیں اور ہوٹ کرتے ہیں۔ بھوک لگی ہو تو سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر حلیم کھاتے ہیں اور پھر کرتے سے منہ پونچھتے ہوئے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ رونے کو جی چاہتا ہے تو پھوٹ پھوٹ کر رو لیتے ہیں۔ اور زندگی میں ہنسنے کا موقع پیدا

منہ بھی ہو تو پیدا کر ہی لیتے ہیں۔ بارہ آنے کی ٹکٹ کے لیے قمیض اور بنیان اتار کر ایک دوسرے کے کندھوں پر سے گزرتے ہوئے کھڑکی تک پہنچ جاتے ہیں اور پھر ساری فلم کے دوران موقع بہ موقع اپنے جذبات کے اظہار کے لیے کھل کر بڑھک بھی لگا دیتے ہیں۔" (۱۲)

شیدا پستول "کھلے ڈُلے" طبقے کا نمائندہ کردار ہے۔ جو اپنے جذبات کو "تہذیب" کے چکر میں دباتا نہیں ہے۔ چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے بھرپور لطف اندوز ہوتا ہے۔ کسی کو دکھ پہنچے تو اس کے آنسو بھی اُس کے دکھ کے اظہار میں شامل ہوتے ہیں۔ یہ طبقہ، یہ کردار کسی کو داد دینے میں کنجوسی کا مرتکب نہیں ہوتا۔ اس کو ہنسنا آتا ہے۔ رونا اور رُلانا بھی۔ اس کی تعلیمی قابلیت ضرور محدود ہوتی ہے۔ مگر خیالات اور جذبات بھرپور وسعت کے حامل ہوتے ہیں۔ یہ دکھ درد میں شریک ہونے والا طبقہ اور کردار ہے۔ معانی میں "عام" مگر مفہوم میں حقیقتاً "خاص"۔ نمود و نمائش سے دور، اپنی روایات سے پیار اور اپنے قرب و جوار میں رہنے والوں سے انس "شیدا پستول" کے طبقے کی امتیازی خوبیاں ہیں۔

یہ کردار تخلیق کرتے ہوئے عطاء الحق قاسمی نے "عوام" کو "شیدا پستول" کے مفہوم میں لیا ہے۔ وہ عوام جو اس معاشرے کی سب سے بڑی طاقت اور تہذیب ہیں۔ جن کے رہن سہن میں تہذیب و ثقافت بسی ہوئی ہے۔ جو ایک دوسرے سے ملتے وقت، اپنائیت اور خلوص سے پیش آتے ہیں۔ جو رشتوں کے احترام اور تعلقات کی خوبصورتی کو مال و زر پر ترجیح دیتے ہیں۔

شیدا پستول دراصل قدرتی طور طریقوں سے زندگی جینے والے طبقے کا نمائندہ کردار ہے۔ طبقاتی تقسیم اور مٹتی تہذیب کے دکھ کو "جعفری اور شیدا پستول" کے نام سے لکھے کالم میں عطاء الحق قاسمی نے بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔

عطاء الحق قاسمی کی حقیقت نگاری اور شگفتہ نگاری کی بہترین مثال یہ اقتباس ہے:

"پھر اس بوسکی کی قمیض والے نے اپنے بائیں جانب والے "کلچرڈ شخص" سے اجازت طلب کی اور این او سی ملنے پر اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے منہ کے گرد دونوں ہاتھ رکھے اور چیخ کر کہا؟

"اوئے شیدے اوٹّے کے بڑھکاں لا، میں جینٹری وچ پھنس گیا آں (اوے شیدے خوب بڑھکیں لگاؤ میں تو جینٹری میں پھنس گیا ہوں) "جینٹری" جو دلن کو ظلم و ستم کرتے دیکھ کر خاموشی سے بیٹھی رہتی ہے۔ جو اپنے کسی مضحک منظر پر اپنے قہقہوں کا گلا دبا دیتی ہے۔ جو کسی درد انگیز سین پر اپنے آنسو آنکھوں کی دہلیز سے باہر نہیں آنے دیتی۔ جینٹری جو پوری خاموشی سے فلم دیکھ رہی ہے۔" (۱۳)

گویا ایک طبقہ بلاوجہ "ضبط" کی بیماری کا شکار ہے۔ جبکہ دوسرا طبقہ اپنی خوشیاں اور اپنے احساسات و جذبات کو دوسروں کے ساتھ مل بیٹھ کر مناتا ہے۔

"شیدا پستول" اک کردار کے ساتھ ساتھ اک خوبصورت سوچ کا نام بھی ہے۔ یہ سوچ آج کل کے دور میں بہت مثبت اور کارآمد ہے۔ محدود وسائل اور نت نئے مسائل سے بھری زندگی میں مسکرانا اور قہقہہ لگانا کسی نعمت سے کم نہیں۔ مسکراہٹوں کو بانٹنا اور شگفتہ قہقہوں کو محفل میں بکھیرنا۔ اہلِ محفل کو اپنی خوشیوں میں شامل کرنا۔ ایک دوسرے کے دُکھ درد میں شریک ہونا۔ "کلچرڈ" ہونے سے بہتر ہے۔ گُھٹ گُھٹ کر مرنے اور گھٹن سے اپنے دل کو پژمردہ کرنے سے بہتر ہے کہ بندہ بلند آواز سے کہے "اوئے شیدے خوب بڑھکیں لگاؤ......

ادبِ لطیف کا 80 سالہ نمبر

1935ء سے شائع ہونے والے
عہد ساز علمی و ادبی جریدے
ادبِ لطیف
کا "80 سالہ نمبر" زیرِ ترتیب ہے
اس خصوصی نمبر کی ذمہ داری
مظہر سلیم مجوکہ کو سونپی
گئی ہے
جن کا فون نمبر / 0333-4377794
0321-4377794
ان کا پوسٹل ایڈریس
کتاب ورثہ، فیروز سنٹر، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار لاہور
کتاب دوست، فیروز سنٹر، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار لاہور
اپنی نگارشات نظم و نثر ای میل کرنے کے لیے IPG
میں اس ای میل ایڈریس پر بھیجیں
kitabvirsa@gmail.com
ذیلی دفتر ماہنامہ ادبِ لطیف
چودھری اکیڈمی الفضل مارکیٹ اُردو بازار، لاہور
37233449
محمد خالد چودھری، بابائے اُردو بازار، لاہور
0300-4112009
چودھری ظفر علی 0333-1421820

کتاب دشمن ہٹلر سے ملاقات

حافظ مظفر محسن

باؤ جی یہ آپ اتنی کتابیں کیوں خریدتے ہیں ......اُنہوں نے مجھے حیرت سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

میں گھبرا سا گیا میں نے اُسے غور سے دیکھا تو وہ بالکل سنجیدہ بھی تھا مجھے یوں لگا جیسے کوئی سنار کسی خریدار سے پوچھے شیخ صاحب آپ آئے دن میری دوکان سے زیورات کیوں خریدتے ہیں (عجب دوکاندار ہے میں نے دل ہی دل میں کڑتے ہوئے سوچا) اور ہاں باؤ جی...... باؤ جی آپ نے عطاء الحق قاسمی کی کتاب "بارہ سنگھے" چھ سات مرتبہ میری ہی دوکان سے خریدی ہے......نذیر انبالوی کی مزاحیات کا انسائیکلو پیڈیا سات آٹھ کاپیاں یہاں سے ہی خریدیں...... باؤ جی کوئی برگر شرگر ہو تو بندہ کہتا ہے کہ چلو روز بھوک لگ جاتی ہے روز خریدتا ہوں اور کھالیتا ہوں ......اُس نے معنی خیز نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے پھر سوال کیا......ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ پھر بولا اور مرزا ادیب کی ایک پرانی کتاب "مٹی کا دیا" کی بھی آپ تین چار کاپیاں خرید چکے ہیں (حالانکہ اُسے کون بتائے کہ کتاب کبھی پرانی نہیں ہوتی ......علم کبھی بوسیدہ نہیں ہوتا) سعد اللہ شاہ، امجد اسلام امجد، اعتبار ساجد اور فرحت عباس شاہ کی بھی آپ کتابیں کئی بار خرید چکے ہیں رحیم گل کا ناول "جنت کی تلاش" بھی بہت دفعہ آپ نے لیا شاید یہ ناول تو پبلشر صرف آپ کی ہی ضرورت کے لیے بار بار چھاپ رہا ہے۔ اُس نے طنزیہ انداز میں مجھے گھورتے ہوئے کتابوں کا بنڈل میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے پوچھا......ابھی میں جواب سوچ ہی رہا تھا اور گھبراہٹ کے باعث میرے ہاتھ بھی کانپ رہے تھے اور شرمندگی کی وجہ سے ماتھے پر پسینہ بھی آ رہا تھا کہ وہ پھر سے بولا ......"یہ جو کتاب کا بنڈل میں نے آپ کو تھمایا ہے اس میں بھی منیر نیازی کی شاعری کی کتاب کی تین کاپیاں ہیں عابد کمالوی کی کتاب "جانِ جاناں" کی بھی تین کاپیاں ہیں یہاں تک کے عرفان صدیقی کے کالموں کی کتاب کی بھی آپ نے چار کاپیاں میرے سے ایک ساتھ خرید لی ہیں اور اختر علی کی کتاب "بیچ کی کھڑکی" اور عارفہ صبح خان کے کالموں کی کتاب کی اکٹھی دس دس کاپیاں ایک ساتھ" وہ بولتا جا رہا تھا اُس کا منہ بھی ضرورت سے زیادہ کھلا ہوا تھا اور آنکھیں بھی میں نے بولنے کے لیے منہ کو کھولنا چاہا کہ اُس نے پہلے سے ہی کھلے ہوئے منہ کا پھر سے استعمال شروع کر دیا......اس دوران میری نظر بابا نجمی خان کی کتاب "کاجل کوٹھا" پر پڑی اور میں نے ہاتھ بابا نجمی خان کی کتاب کی طرف بڑھایا......

اگر آپ دوکانداروں کے اصولوں کے مطابق کتابوں کی قیمت کم کر کے یا دس پندرہ فیصد رعائت کرا کے لیتے تو میں سمجھتا کہ آپ کی کہیں اپنی دوکان ہے اور آپ مجھ سے خرید کر کتابیں اپنی دوکان پر لے جا کر فروخت کر دیتے ہیں مگر آپ تو مجھ سے کتابیں پوری قیمت پر ہی خرید کر لے جاتے ہیں آخر آپ ہیں کون اور یہ سب کیا ہے......؟ مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے اونچی بول کر اُس کی بات کاٹ دی...... یار ہٹلر بھائی (اُس کی مونچھوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے میں نے وہیں کھڑے کھڑے اُسے یہ نام دیا......وہ اس نام پر خوب مسکرایا اور اُس نے اس نام کا برا بھی نہیں منایا...... شاید اُسے اچھا لگا جب تم کسی عزیز دوست یا رشتے دار کے بچے کی سالگرہ پر جاتے ہو تو کیا لے کر جاتے ہو...... وہ بولا باؤ جی بچے کے حساب سے ہی تحفہ بھی لے جاتا ہوں پڑھے لکھے رشتے دار کا بچہ ہو تو ویڈیو گیم یا کوئی کمپیوٹر ٹائپ کھلونا اور اگر ان پڑھ یا کم پڑھے لکھے لوگوں کے گھر بچے کی سالگرہ وغیرہ پر جانا ہو تو پھر بچے کے لیے منہ سے بجانے والا باجا "پاں پاں پاں" ......(اُس نے منہ سے بجایا) تاکہ وہ ٹاں ٹاں کرتا پھرے اور گھر والے جب بچہ ان کے کان کے پاس جا کر ٹاں ٹاں کرے مجھے یاد کریں کہ یہ ہٹلر دے گیا ہے میں نے وضاحت کی ہٹلر بھائی ایسے ہی جب میں کسی دوست رشتے دار کے ہاں سالگرہ پر جاتا ہوں تو بہت پڑھے لکھے کے لیے علامہ اقبال، مرزا غالب، فیض منیر نیازی، احمد فراز یا افتخار عارف، عطاء الحق قاسمی وغیرہ کی کتابوں کا سیٹ لے جاتا ہوں مزاحیہ پسند کرتا ہو تو ڈاکٹر محمد یونس بٹ، عطاء الحق قاسمی، شفیق الرحمٰن، انور مسعود یا خالد مسعود خان وغیرہ کی کتابوں کا سیٹ لے جاتا ہوں نوجوان ہو تو نوجوان پھر نوشی گیلانی، پروین شاکر، سعد اللہ شاہ، وصی شاہ، فرحت عباس شاہ یا خالد شفیق وغیرہ کی کتابیں چل جاتی ہیں اور اگر کوئی مذہبی

ہستی ہو تو کشف والمحجوب، الہی الخاتم، ترجمان القران یا حفیظ تائب کی نعتیہ شاعری یا پھر کوئی اور مذہبی کتاب اور (اُس نے حسب عادت میری بات کاٹ دی اور اگر کوئی میٹرک فیل ہو تو پرانے اخباروں کا بنڈل یا پرانی انارکلی سے تین چار روپے میں تھوڑے سے خریدی ہوئی کتاب بات مزدار تھی مگر مجھے ہنسی نہ آئی کیونکہ میں ہٹلر بھائی کے ساتھ خواہ مخواہ فری نہیں ہونا چاہتا تھا (اُس وقت) کیونکہ میرے اُس سے نظریاتی اختلافات شروع ہو چکے تھے میرا پارہ مزید چڑھتا جا رہا تھا ہٹلر بھائی کے اس ظالمانہ رویہ کے باعث وہ بھی شاید ایسا ہی سوچ رہا تھا اور ایک دم ضرورت سے زیادہ سنجیدہ ہو گیا اور بول اُٹھا ...... باؤ جی لوگوں کی عادتیں خراب نہ کرو اچھا تو پھر میں بھی تمہاری طرح منہ سے بجانے والے باجے ہی سالگرہ پر تحفہ میں دینا شروع کر دوں ٹال ٹال کرنے کے لیے میں نے غصے سے کہا تو اُس نے بھی مجھے گھورا اور وہ بنڈل جو میں نے غصے میں اُس کے بے ہودہ سوال کا جواب دینے کے لیے اُس کے اسٹول پر رکھ دیا تھا میرے ہاتھ میں تھما دیا تا کہ میں وہاں سے دفع ہو جاؤں گویا میرے اُس کے نظریاتی اختلافات خاصے سنجیدہ شکل اختیار کر چکے تھے میں نے پیسے تھمائے سلام دعا بھی نہ کی اور باہر نکلنے لگا تو اُس نے میرا ہاتھ تھام لیا اور بولا ...... باؤ جی میں نے تو آپ کا بھلا سوچا تھا کیونکہ آپ تو میرے گاہک ہیں اور گاہک اللہ کی رحمت ہوتی ہے (گاہک ہٹلر بھائی اللہ تعالیٰ کی رحمت ہوتی ہے اگر اُس نے چادر یا ڈوپٹہ اوڑھ رکھا ہو اور اگر مونچھیں ہوں تو پھر گاہک اللہ کی زحمت ہوتا ہے) میری وضاحت پر ہنس پڑا اور میری بھی ہنسی نکل گئی ...... میں نے ہاتھ ملایا اور چلنے لگا تو اُس نے اپنا اسٹول میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا (نہایت پیار سے) باؤ جی دودھ پتی منگوائی ہے پی کر جانا ملائی والی ہے ...... ہٹلر بھائی کو میری اس کمزوری کا پتہ تھا اور میں چلتے چلتے رُک گیا رُکتا رُکتا بیٹھ گیا ملائی والی دودھ پتی کے انتظار میں ہر انسان کے اندر ایک بچہ چھپا ہوتا (راجہ صفدر آف ماڈرن جیوٹ کے بقول میرے اندر کا بچہ ابھی کم عمر ہی ہے اور ہر بچے کے اندر ایک لالچی انسان (چھوٹے بڑے سب بچوں سے معذرت) میں مزے لے لے کر دودھ پتی پی رہا تھا کہ وہ بول پڑا (اُس کی آنکھوں سے شرارت ٹپک رہی تھی) باؤ جی ایک نئی کتاب آئی ہے نئے پرانے لطیفے وہ بھی دس کا پیاس پیک کر دوں مجھے بہت غصہ آیا اُس نے بھی بھانپ لیا یار ہٹلر بھائی کاش تم پڑھے لکھے ہوتے تو آج میں تمہیں انگلستان کے مشہور لکھاری برٹرینڈ رسل کا ایک مشہور اور نہایت مزے دار مضمون پڑھنے کو دیتا میرے منہ سے نامکمل فقرہ نکلا ہی تھا کہ وہ بول پڑا ...... مظفر بھائی جس میں برٹرینڈ رسل نے لکھا ہے کہ اس دنیا میں کوئی آدمی اپنی مرضی سے زندگی نہیں گزار رہا جسے صحافی بننا چاہیے تھا وہ لوہار بن گیا جسے لوہار بننا چاہیے تھا وہ استاد بن گیا جسے پاگل خانے میں ہونا چاہیے تھا وہ سیاستدان بن گیا وغیرہ وغیرہ اور پھر وغیرہ میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا ...... ہٹلر صاحب آپ کون ہیں اور یہ میرے ساتھ آج آپ نے یہ سب کیا کیا ہے میں نے عینک کے اوپر سے جھانکتے ہوئے پوچھا ...... اس دوران دوکان پر کام کرنے والا ایک لڑکا کتابوں کے ایک بڑے سے بنڈل پر چڑھ کے اوپر والے ریک سے کتاب اتارنے لگا تو ہٹلر نے پاس پڑی کتابوں پر سے مٹی اتارنے والی جھاڑن اُس کی ٹانگوں پر زور سے دے ماری اور بولا ...... کمینے انسان یہ کتابیں علم ہیں یہ اللہ کا نور ہیں علم مقدر والوں کو ملتا ہے ان کتابوں ان لفظوں کا احترام ہم سب پر فرض ہے میں مزید حیرت زدہ ہوا ہٹلر بھائی پھر بولا ...... مظفر محسن صاحب مجھے آپ کا بار بار میری دوکان پر آنا اس قدر کتابیں خریدنا مجھے اچھا لگتا ہے آج کے دور میں بھی علم کے قدر دان دیکھتا ہوں تو مجھے سکون ملتا ہے بڑی خوشی محسوس ہوتی ہے اور یقین بھی ہوتا ہے کہ میرے پاکستان کا مستقبل روشن ہے کہ یہاں آج بھی لوگ کتابوں سے پیار کرتے ہیں اور تحفے میں ایک دوسرے کو کتابیں دیتے ہیں اللہ کرے کتابیں تحفے میں دینے کا رواج عام ہو (میں نے آپ کا وہ مضمون بھی پڑھ رکھا ہے جس میں آپ نے لکھا ہے کہ علامہ اقبال کا سارا کلام حکومتی سطح پر چھپے اور ہر پڑھنے والے کو مفت ملے) کیونکہ مغرب اور امریکہ میں تو یہ رواج عام ہے اور ہماری نئی نسل بھی اس طرف راغب ہو ...... میں چلنے لگا تو ہٹلر بھائی نے مجھے ایک شاعری کی کتاب "راز محبت" پیش کی جس پر شاعر کا نام لکھا تھا باقر حسین باقر ...... میں نے وہیں کتاب کی تھوڑی سی ورک گردانی کی اس دوران کتاب کی پشت پر چھپنے والی تصویر پر میری نظر پڑی تو میں اُچھل پڑا کیونکہ وہ تو ہٹلر بھائی کی اپنی ہی تصویر تھی ہم دونوں بغل گیر ہوئے اور زور زور سے ہنسنے لگے ......

افسانہ

کمی

نعمان منظور

تین ہزار نفوس پر مشتمل گاؤں کوٹ سرداراں میں آج موت کی سی خاموشی طاری تھی۔ پانچ سو کچے پکے مکانوں سے دور کھیتوں میں کام کرتے مرد بھی ایک دوسرے سے اپنا دانستہ گریز چھپانے کے لیے، اپنے اپنے کام میں مگن دکھائی دینے میں لگے تھے لیکن اس عالم میں بھی گاؤں کے ایک گھر سے ہلکی ہلکی سرگوشی جیسی سسکیاں بلند ہو رہی تھیں اور وہ گھر گاؤں کے کمہار اشرف کا تھا جسے سب اچھو کمہار کہتے تھے۔

اچھو کمہار کئی پیڑھیوں سے اس گاؤں میں آباد تھا۔ کوٹ سرداراں میں شاید ہی کوئی ایسا گھر ہو جس میں اچھو کمہار کے ہاتھوں بنے برتن، صراحیاں اور مٹکے استعمال نہ ہوتے ہوں۔ سرداروں کی حویلی میں بھی حسین صراحیاں اور رنگین مٹکے بھی اسی گاؤں کے اسی شاندار ہُنر مند نے بنائے اور سجائے تھے۔

اچھو کے ہاتھوں میں جادو تھا، جب وہ مٹی کے بوتے بنا کے چاک پر چڑھاتا تو اس کی جون ہی بدل جاتی۔ اُس وقت اچھو ایک عالم بے خودی میں نظر آتا۔ چاک کی گردش پر مسلسل چلتے ہوئے مٹی کے بوتے پر اچھو کے ہاتھ مہارت سے چلتے اور مٹی کے اُس بوتے کو ایک نہایت خوبصورت چیز میں ڈھال دیتے۔ اچھو اپنی بنائی ہوئی چیزوں سے بے پناہ عشق کرتا تھا۔ انہیں چاک سے اتار کے خود ہی آوی میں رکھتا اور اس کے اوپر اُپلے رکھ کے انھیں آگ لگا دیتا۔ اچھو کے پاس کوئی گھڑی تو تھی نہیں لیکن اُسے وقت کا اندازہ بخوبی رہتا تھا۔ مجال ہے کہ کوئی گھڑا یا، برتن ضرورت سے زیادہ پک جاتا یا کچا رہ جاتا۔

آج پورے گاؤں میں صرف اسی اچھو کے گھر میں ہلکی ہلکی سرگوشیوں اور مدھم آواز میں سسکنے کی آواز آرہی تھی۔ کچے صحن کے ایک گوشے میں مٹی کا ڈھیر دھوپ لگنے سے سوکھ رہا تھا۔ چاک خاموش اور آوی سنسان پڑا تھا۔ دوسرے کونے میں کل کے بنے ہوئے برتن، صراحیاں اور مٹکے اور بچوں کے کھیلنے کے کچھ کھلونے سوکھے پڑے تھے۔ اچھو کو آج صبح انہیں دھوپ نکلنے کے تھوڑی دیر بعد اُٹھا لینا چاہیے تھا لیکن افتاد ہی ایسی آن پڑی تھی کہ دھوپ میں رکھے ہوئے برتنوں میں تریڑیں پڑنا شروع ہو گئی تھیں لیکن اچھو کا دھیان کہیں اور تھا۔ اچھو صحن میں بنے ایک کچے سے چبوترے پر جس کے چاروں طرف ڈنڈے گاڑ کے اُن کے اوپر ایک میلی سی چادر تان دی گئی تھی، اپنی ماں اور بیٹے جمیل کے ساتھ بیٹھا کچے فرش کو تکے جا رہا تھا۔ آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ آنسو اچھو کے گالوں سے پھسلتے ہوئے مٹی میں رُلتے جا رہے تھے۔ اچھو کی بوڑھی ماں ڈوپٹے کو منہ پر رکھے ہولے ہولے اللہ تعالیٰ سے مدد کی فریاد میں مصروف تھی۔ جمیل دادی کے گھٹنوں میں سر دبائے سسکیوں سے رو رہا تھا۔ اچھو کی بیوی پچھلے برس بیٹے سے مر گئی تھی، سو گھر میں ان تین نفوس کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔

اچھو کی ماں روتے ہوئے بولی 'اچھو کیا ہوگا؟'

'کیا ہونا ہے ماں؟ وہی ہوگا جو سردار صاحب فیصلہ کریں گے' اچھو نے سسکیوں بھرے لہجے میں ماں کو جواب دیا۔

'پُتر تو نے مولوی صاحب سے بات کی؟'

''اس دفعہ ماں کے لہجے میں اُمید تھی'

'کی تھی بات میں نے، مولوی صاحب سے بھی، لیکن وہ بھی کہتے ہیں کہ فیصلہ تو سردار صاحب نے ہی کرنا ہے۔' اچھو کی آواز میں ناامیدی اپنی پوری توانائی کے ساتھ در آئی تھی۔

دادی کے گھٹنوں میں سر چھپائے روتے ہوئے جمیل نے سر اٹھایا اور دادی سے کہنے لگا، 'دادی، مجھے اپنی ماں کی قسم، دادی تمہاری قسم، میں نے کچھ بھی نہیں کیا، یہ کہہ کر جمیل پھر رونے لگا۔

اچھو! میں نے تجھے کل بھی بتایا تھا کہ میرا جمیل ایسا نہیں ہے، دادی اپنے پوتے کی حمایت میں پھر بولی۔

'تو میں نے کون سا اسے قصوروار ٹھہرا دیا ہے ماں!' میرا تو خود اپنا کلیجہ کٹ رہا ہے' جمیل نے آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے ماں کو جواب دیا۔

'پتر گاؤں والے کیا کہتے ہیں؟'

'ماں دیکھتی نہیں؟ آج گاؤں میں موت کیسی خاموشی ہے! کہیں سے کوئی آواز آرہی؟

گاؤں والے کیا کہیں گے؟ ہم تو

سردار صاحب کے حکم کے پابند ہیں۔

'جمیل پتر، تو نے ایسا کیوں کیا؟ اب اچھو نے جمیل کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا

'ابا، میں نے صرف چھوٹی سردارنی کو گرنے سے بچنے کے لیے پکڑا تھا' جمیل نے سرخ آنکھوں سے جواب دیا۔

'ذرا دوبارہ سے بتا مجھے ساری بات'، اچھو نے جمیل کو کہا۔

'ابا کل میں نہر کنارے سے مٹی اُٹھا اُٹھا کے کھوتی ریڑھی بھر رہا تھا۔ ابھی سورج اُدھر پرے سرداروں کی حویلی کے اوپر ہی تھا۔ اچانک میں نے لڑکیوں کے ہنسنے کی آواز سُنی۔ میں نے مڑ کے دیکھا تو چھوٹی سردارنی اپنی سہیلیوں کے ساتھ نہر کے ساتھ ساتھ آ رہی تھی۔ اب قسم ہے اللہ میاں کی، میں نے انہیں صرف ایک نظر دیکھ کر آنکھیں جھکا لیں تھیں اور مٹی کھودنے لگا۔ چھوٹی سردارنی خود میرے پاس آ کے رُکی اور کہنے لگی

'جمیل کیا کر رہے ہو؟'

میں نے آنکھیں نیچی رکھتے ہوئے انہیں بتایا کہ مٹی کھود رہا ہوں'

یہ سن کر وہ آگے چلنے لگیں تو اُن کا پاؤں مڑ گیا اور وہ گرنے لگیں۔ میں نے جلدی میں اُن کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس طرح وہ گرنے سے بچ گئیں۔

'گر کے مر جاتی تو ٹھیک تھا'، دادی بیچ میں ہی بول پڑی

'ماں، تو چپ ہو جا، ذرا مجھے سُننے دے'، اچھو نے ماں سے کہا

'بس اب اتنی سی بات ہوئی تھی'، میں نے چھوٹی سردارنی کا ہاتھ پکڑ کر انہیں گرنے سے بچایا اور انہوں نے شور مچا دیا کہ میں نے جان بوجھ کے اُن کا ہاتھ پکڑا ہے۔ اُن کے شور مچانے پر اُن کے پیچھے آنے والے منشی اور اُس کے بندوں نے مجھے پکڑ لیا اور مارنے لگے۔ یہ دیکھ ابا، جمیل نے کر سے قمیض اٹھائی اور بولا۔

'یہ دیکھ ابا'

اچھو اور دادی نے جمیل کی کر دیکھی جو نیلے رنگ کی ہو رہی تھی۔ اُس پر لاٹھیوں اور ٹھڈوں کے نشان تھے۔ دادی نے آہستہ سے اپنا بوڑھا جھریوں والا ہاتھ جمیل کی کمر پر رکھا اور آسمان کی طرف ملتجی نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ 'پھر' اچھو نے دوبارہ جمیل سے پوچھا

'ابا، پھر انہوں نے مجھے مار مار کے ادھ موا کر دیا اور منشی اپنے آدمیوں سے کہنے لگا کہ 'مسجد میں منادی کروا دو کہ کل دوپہر کو پنچایت لگے گی اور اس مردود کا فیصلہ سردار صاحب خود کریں گے۔ اس کی کی جرأت تو دیکھو کہ سردار صاحب کی بیٹی کا ہاتھ پکڑ لیا۔

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ کسی نے اچھو کے گھر کا دروازہ پیٹا۔ تینوں ہڑبڑا گئے۔ اچھو نے کھڑے ہونا چاہا لیکن ٹانگیں اُس کا بوجھ سہار نہ پائیں۔ اچھو نے لڑکھڑا کے بانس کا سہارا لیا اور آہستہ آہستہ دروازے کی طرف چل پڑا۔ ایک ہی رات نے اچھو کو کئی برسوں کا بوڑھا بنا دیا تھا۔ اچھو نے دروازہ کھولا تو باہر گاؤں کی مسجد کے پیش امام کھڑے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی اچھو کے چہرے پر امید کی ایک لہر دوڑ گئی۔

'جی مولوی صاحب'

'چلو اچھو، جمیل کو بھی ساتھ لے چلو' مولوی صاحب نے جھکی جھکی نگاہوں سے اچھو کو کہا

'مولوی صاحب کچھ رعایت نہیں ہو سکتی۔ یہ معاملہ ٹل نہیں سکتا، اچھو نے مولوی صاحب کے آگے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا

'اچھو میں مجبور ہوں' - جلدی کرو، کہیں سردار صاحب پہنچ نہ جائیں'

'آ جمیل پتر، چلیں، جو ہمارا مقدر، جو سوہنے رب کی رضا، ہم اُس کی رضا میں راضی، اچھو نے جمیل کو آواز دی۔ دادی نے جمیل کو سینے سے لگا لیا اور اونچی آواز میں رونے لگی۔

'نہ ماں! رو ناں!، اللہ بہتر کرے گا۔ تو بس دعا کر، اچھو نے دروازے سے ہی آواز لگائی، اتنے میں جمیل بھی آنسو صاف کرتا ہوا دروازے تک آ پہنچا۔

'چلو بھئی چلو، دیر ہو رہی ہے'، مولوی صاحب نے باپ بیٹے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

مولوی صاحب آگے اور باپ بیٹا اُن کے پیچھے چلنے لگے۔ گاؤں کی گلیاں ابھی تک ویران تھیں۔ ان کے گھر پر مولوی صاحب کے آنے اور انہیں ساتھ لے جانے کا سن کر آہستہ آہستہ گھروں کے در دروازے کھلنے لگے، عورتیں اور چھوٹے بچے دروازوں اور چھتوں سے ان تینوں کو گاؤں کے چوراہے پر جاتے ہوئے خاموشی سے دیکھ رہے تھے۔ کسی گھر سے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ یہ تینوں جونہی چوراہے کے نزدیک پہنچے تو دیکھا کہ گاؤں کے سبھی مرد چوراہے پر برگد کے سامنے

زمین پر سر جھکائے بیٹھے تھے۔ اچھو اور جمیل کو دیکھتے ہی گاؤں والوں کی آنکھوں میں اداسی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اچھو کے بچپن کے ساتھی، گاؤں کے بزرگ بھی نے ایک نظر ان پر ڈالی اور دوبارہ اپنی آنکھیں جھکالیں اور ہاتھوں سے آنکھوں میں اترتی نمی صاف کرنے لگے۔

برگد کے نیچے بنے چبوترے پر ایک بڑی سی کرسی رکھی ہوئی تھی۔ مولوی صاحب نے اچھو اور جمیل کو اشارے سے چبوترے کے سامنے نیچے زمین پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود چبوترے پر چڑھ کے کرسی کے پیروں میں بچھی ہوئی چٹائی پر بیٹھ کے داڑھی میں ہاتھ پھیرنے لگے۔ مجمع پر ایک سناٹا طاری تھا۔ سورج اپنی پوری توانائی کے ساتھ زمین پر بیٹھے لوگوں پر گرمی کی لہریں پھینک رہا تھا لیکن مجال ہے کوئی ہاتھ پسینہ تک پونچھنے کے لیے اُٹھا ہو۔ آج تو ہوا تک برگد کی بوڑھی شاخوں کی چھاؤں تلے زمین پر بیٹھے لوگوں سے کترا کر گزر رہی تھی۔

چبوترے پر بیٹھے مولوی صاحب کی نظریں مجمع کے پیچھے جمی ہوئی تھیں۔ دور سے اڑتی دھول دیکھ کر مولوی صاحب ہڑبڑا کے اُٹھ بیٹھے۔ اُن کا اُٹھنا تھا کہ گاؤں کے سارے لوگ بھی اُٹھ کھڑے ہوئے اور اپنی گردنیں جھکالیں۔ دھول اڑاتی ہوئی تین گاڑیاں، جن میں سے اگلی اور پچھلی گاڑی میں خوفناک شکلوں والے گن مین اور درمیان میں سردار صاحب کی کالی پجارو تھی۔ تینوں گاڑیاں برگد کے سامنے زمین پر بیٹھے گاؤں کے لوگوں پر دھول اڑاتی ہوئی، عین چبوترے کے سامنے آ کے رک گئیں۔ دھول نے چند لمحوں کے لیے زمین پر کھڑے لوگوں کو چھپالیا تھا، لیکن اب بھی اپنے سر سے دھول اڑانے کے لیے کوئی ہاتھ بلند نہیں ہوا تھا۔ گن مینوں کے اترتے ہی کالی پجارو کا دروازہ کھلا اور سردار صاحب نے اپنے قدم زمین پر رکھے تو گویا لوگوں کے سانس خشک ہو گئے تھے۔ سردار صاحب نے مجمع پر ایک حقارت بھری نگاہ ڈالی اور چبوترے پر رکھی کرسی پر بیٹھ گئے۔ اُن کے بیٹھتے ہی منشی نے لوگوں کو بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا اور مولوی صاحب کی طرف دیکھا۔ مولوی صاحب منشی کا اشارہ پا کر اپنی جگہ اور زیادہ مؤدب ہو کے کھڑے ہوئے اور مجمع سے مخاطب ہوئے کہنے لگے۔

'کوٹ سرداراں کے لوگو، آج یہ پنچایت اس لیے لگائی گئی ہے کل گاؤں کے ایک کی کمہار کے بیٹے نے سردار صاحب کی بیٹی کا ہاتھ پکڑا اور اسے چھیڑا۔ گاؤں کے رواج کے مطابق مجرم کی نہ تو کوئی بہن ہے نہ ماں، اس لیے اس مقدمے کا فیصلہ آج خود سردار صاحب کریں گے۔' یہ کہہ کر مولوی صاحب نے خوشامدی انداز میں جھکتے ہوئے سردار صاحب سے مقدمے کا فیصلہ سنانے کے لیے کہا۔ سردار صاحب نے کرسی کے سامنے رکھی چھوٹی سی میز پر جوتوں سمیت اپنے پاؤں رکھے اور تھوڑا سا آگے کی طرف جھکتے ہوئے کہنے لگے

'میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ میں گاؤں کے کمی کمینوں کے فیصلے کروں لیکن معاملہ میری بیٹی کا ہے اور اگر اس کمہار کی بیوی زندہ ہوتی یا کوئی بیٹی ہوتی تو...... اتنا کہہ کر سردار صاحب زیرِ لب مسکرائے اور پھر گویا ہوئے

'اچھو کمہار چونکہ اپنے باپ دادا کے زمانے سے ہمارا وفادار ہے اور ہم وفاداروں کی قدر کرتے ہیں اس لیے اس کے بیٹے جمیل کو سزا تو ضرور ملے گی لیکن ذرا کم۔' اتنا کہہ کر سردار صاحب منشی سے مخاطب ہو کے بولے

'منشی'

منشی نے سردار صاحب کے سامنے جھکتے ہوئے عاجزانہ لہجے میں پوچھا

'سردار صاحب، حکم'

'منشی، اس لڑکے جمیل نے کون سے ہاتھ سے ہماری بیٹی کو پکڑا تھا'

'سردار صاحب سیدھے ہاتھ سے'

'ٹھیک ہے اس کا سیدھا ہاتھ کاٹ دو' یہ کہہ کر سردار صاحب نے سامنے رکھی میز کو پاؤں سے ٹھوکر ماری اور چبوترے سے اُتر کے پجارو میں جا بیٹھے۔ اُن کے گاڑی میں بیٹھتے ہی منشی کے کارندوں نے روتے ہوئے جمیل کو پکڑا اور اسی چبوترے کے اوپر اُس کا سیدھا ہاتھ رکھ کے کلہاڑی کے ایک ہی وار سے جمیل کا ہاتھ کاٹ دیا۔ ہاتھ کا کٹنا تھا کہ لہو کا ایک فوارہ اُٹھا اور بیہوش ہوتے ہوئے جمیل کے ساتھ ساتھ منشی کے کپڑوں کو بھی بھگو گیا۔ بیہوش ہونے سے پہلے دس برس کے جمیل کے ننھے سے ذہن میں صرف یہ بات آ رہی تھی کہ سردار صاحب کی بیٹی نے گرنے سے بچنے کے لیے خود اپنا ہاتھ جمیل کے ننھے سے ہاتھ کی طرف بڑھایا تھا۔

افسانہ

پہلی کرن

ارم زہراء

رات جونہی اپنی کالی چادر پھیلانے لگی، بنفشے کے پھول پر بیٹھی بے خبر تتلی جو پروں کو جوڑے کسی سوچ میں گم تھی' جلدی سے واپسی کے لئے مڑی' تبھی قریب بیٹھی نیلی چمکدار مکھیوں کا جھنڈ اپنی لمبی دم کے ساتھ شائیں،شائیں کرتا تتلی کے پیچھے اپنے' اپنے گھروں کی جانب رواں دواں ہوا۔

بنفشے کے پھولوں کی ایک طرف کانٹے دار جھاڑیاں دور تک پھیلی ہوئی تھیں' وہیں دوسری جانب ایک بڑے سے درخت پر ایک جگنو کا جوڑا اپنی' اپنی سوچوں کے دائرے میں بھٹک رہا تھا' جگنو نے بڑے ہی پیار سے پروں کو پھیلایا اور ایک طویل انگڑائی لی اور پیار سے اپنی مادہ جسے وہ جگنی کہتا ہے اُسے مخاطب کیا۔

''ارے سنتی ہو۔۔۔۔۔۔۔ اُدھے پٹری کے پاس ایک عورت چادر میں ملبوس تنہا کھڑی نظر آرہی ہے'' جگنی نے آہستگی سے شاخ پہ رکھے سر کو اٹھایا اور اچکتے ہوئے پھیلتے اندھیرے میں بغور دیکھا۔۔۔۔

''ارے بھولے یہ یہاں کاہے کو کھڑی ہے' کیا اُس کو خبر نہیں کہ رات کتنی اندھیری ہے اور پھر یہاں کی تنہائی۔۔۔۔۔ کہیں یہ راستہ تو نہیں بھول گئی؟''

''چل میری پیاری' شاید ہم اس کی کچھ مدد کرسکیں'' جگنو نے جواب طلب نظروں سے جگنی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں ہم کچھ نہیں کرسکتے'' جگنی غرائی۔

''تو کیا ہم اِسے اس کے حال پر ہی چھوڑ دیں گے؟'' جگنو خائف لہجے میں بولا۔

''ارے پگلے جب اندھیرا حد سے بڑھ جائے گا اور سرد ہواؤں کے جھکڑ مست ہو کر زمین پر چلیں گے اور درختوں کے پتے سرسراتے ہوئے رقص کرنے لگیں گے تو یہ خود ہی واپسی کے لئے پلٹ جائے گی' تم گھبراؤ نہیں' یہ کوئی نئی بات نہیں ہے' ایسی کتنی ہی کہانیاں میرے سامنے دم توڑ چکی ہیں'' جگنی بڑے ہی اطمینان سے بولی۔

''تُو' تو بڑی ظالم ہے۔۔۔۔۔۔ مادہ ہوکر ایسی باتیں کرتی ہے'' جگنو جل کر بولا اور پہلو بدل گیا۔ جگنی نے بھی جگنو کو گھور کر دیکھا اور نظریں جھکائے بیٹھ گئی۔

''اب کیوں چپ ہوگئی؟'' جب خاموشی بڑھ گئی تو جگنو نے نہ چاہتے ہوئے بھی جگنی کو مخاطب کیا۔

''اب میں کیا بولوں تم ہو ناں نر' جو بڑے رحمدل ہوتے ہیں جن کے سینے میں سارے جہان کا دکھ درد چھپا ہوتا ہے اونہہ! جن کی رحمدلی اپنوں کے بجائے غیروں کے لئے ہوتی ہے۔'' جگنی نے گویا طنز کی گولہ باری شروع کردی تھی۔۔۔۔۔۔

''چل ٹھیک ہے تُو جیتی' میں تو چلا سونے'' جگنو نے سر کو اپنے پروں میں چھپاتے ہوئے کہا۔

رات آہستہ، آہستہ اپنے کالے پنجے مضبوطی سے گاڑ رہی تھی' سارے پرند خوفزدہ سے اپنے' اپنے گھونسلوں میں دبکے بیٹھے تھے' ایسے میں سرد ہوا کے جھکڑوں کے درمیان جگنی فضا میں اضطراب کے عالم میں چکر کاٹنے لگی۔

''ارے سنتے ہو مجھے اس عورت کی سسکیاں سنائی دے رہی ہیں' سردی سے کپکپاتے اس کے ہاتھوں میں ایک گٹھڑی بھی ہے' اور وہ شدت سے رو رہی ہے' اب کیا ہوگا۔۔۔۔۔۔؟''

''کیا ہونا ہے' رات کا اندھیرا اسے گھر بھیجنے پر مجبور کردے گا یا پھر وہ سردی کی شدت سے مرجائے گی...... بے چاری!'' جگنو نے کاٹ دار لہجے میں جگنی کو جواب دیا۔

''اونہہ تُو' تو بڑا بے رحم ہے۔'' جگنی دوبارہ شاخ پر آبیٹھی۔''

''دیکھو میں نے عورت کے لبوں پر نوحے مچلتے اور آنکھوں میں دکھ بہتا دیکھا ہے مگر وہ اتنی کمزور نہیں ہے' اس کی چال بوجھل ضرور ہے مگر وہ نڈھال نہیں ہے' اس کی انگلیوں کی گرفت بتاتی ہے' ضرور اس کی گود میں کوئی قیمتی شے ہے۔''

''ایک تو تیری کھوجنے والی نظروں سے میں بڑا پریشان ہوں' قیمتی شے ہے' یہ نہیں دیکھتی کہ بے چاری اتنی رات کو کیوں گھر سے باہر نکلی۔'' جگنو نے سینہ پھلا کر بیٹھی ہوئی جگنی کو مخاطب کیا۔۔۔۔۔

''میں سوچ رہا ہوں بڑی ہی نادان لڑکی ہے' مستقل چل رہی ہے' اگر شکار ہوگئی تو۔۔۔۔۔۔؟ جگنو آہستگی سے بولا۔

''خبردار۔۔۔۔۔۔! جو غلط بات منہ سے نکالی' وہ مجھے کافی سمجھدار لگتی ہے'' آسمان پر چمکتے ستاروں کو دیکھ کر جگنی نے امید بھری نظر جگنو پر ڈالتے ہوئے کہا۔

''اچھا۔۔۔۔ !'' جگنو نے بڑے ہی معنی خیز انداز میں کہا اور بڑبڑانے لگا۔ ''ہمیشہ اپنی ہی کرتی ہے۔''

جگنی نے ایک جھرجھری لی پھر بولی ''تمہیں یاد ہیں ناوہ راتیں' جو انتہائی لمبی ہوا کرتی تھیں' کبھی نہ ختم ہونے والی راتیں' جب دریا خشک ہوگئے تھے اور مچھلیاں بے وطن' کچھوے نم ریت کی تلاش میں بھٹکتے پھر رہے تھے اور مگرمچھ تو یوں دھاڑ رہے تھے گویا ان کا کوئی رفیق القلب گزر گیا ہو' مجھے اچھی طرح یاد ہے' ان دنوں پتے بھی درختوں کی بانہوں سے جدا ہوگئے تھے اور جب وہ بھاگتے دوڑتے کتوں کے پیروں کے نیچے چرمراتے تو میرا دل کانپ کے رہ جاتا۔۔۔۔۔ تمہیں یاد ہے ناں! اُنہی سرد راتوں میں اپنی کھیتوں والی مینا بہن کتنی زخمی اور نڈھال سی پڑی تھی' خدا غارت کرے اس شکاری کو۔۔۔۔''

''ہاں نیک بخت مجھے اچھی طرح یاد ہے وہ رات' میں بھی تو بھاگ کر اس کے ننھے منے بچوں کو

لے آیا تھا۔" جگنو فخر سے بولا۔

"ہاں پھر بچے جس طرح ماں ماں کہتے اس کی طرف لپکے تھے تو وہ ممتا کی ماری کرب کے عالم میں بھی اٹھ کھڑی ہوئی تھی' ورنہ تو اس کا اٹھنا محال نظر آتا تھا' میں نے کتنا اس کو سنبھالنا چاہا مگر میں تو بے سود ہی رہی" جگنی نے فرحت بخش احساس کے ساتھ ایک طویل سانس لیا۔

"ویسے مجھے اسی دن سے ہی تم پر بڑا ناز ہے! مجھے اچھے لگنے لگے ہو ورنہ۔۔۔۔۔۔" جگنی نے شرارت بھرے لہجے میں کہتے ہوئے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"ارے میری مینا تیرا ہی ورنہ تو مجھ میں جینے کی امنگ بیدار کرتا ہے' ویسے تُو بولتی بہت ہے اور قصے تو ایسے طول دے دے کر سناتی ہے کہ بس۔۔۔۔۔!" جگنو ہنس کر بولا تو جگنی شرما گئی۔

"بڑے کٹھور ہو۔۔۔ میری تعریف میں بھی ملاوٹ کر گئے۔"

"ارے کاہے کو ناراض ہوتی ہے' تجھ سنگ تو میں جی رہا ہوں۔۔!" جگنو نے پروں کو پھیلایا اور ایک چھوٹی سی اڑان لے کر جگنی کے قریب بیٹھ گیا۔

"ارے یہ کیا؟ دیکھا اس عورت کو؟" جگنی نے جگنو کی طرف پُر امید نظروں سے دیکھا۔

"ارے چھوڑ نیک بخت اس کو' پتا نہیں کیا چرا کر لائی ہے اور کس کا انتظار کر رہی ہے؟ جگنو منہ بنا کر بولا۔

"یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کی شادی گھر والے اس کی مرضی کے خلاف کر رہے ہوں اور یہ سامان سمیٹ کر بھاگ آئی" جگنی نے اپنا نظریہ پیش کیا۔

"تو پھر تو اس کا محبوب بھی آنے والا ہوگا" جگنو نے ریل کی پٹڑی کے دونوں اطراف دور تک دیکھا اور پھر نفی میں سر ہلا دیا۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے اس کی ساس بہت ظالم ہو اور ظلم کرتی ہو اس پر' اسی وجہ سے یہ اپنا گھر چھوڑ آئی۔" جگنی نے اپنی سوچ کا دوسرا پہلو بھی پیش کر دیا۔

"اری نیک بخت چھوڑ دے اس کو اس کے حال پر اب اگر یہ گھر لوٹی تو گھر والے اسے قبول نہیں کریں گے۔" جگنو نے خدشہ ظاہر کیا۔

"یہ باتیں تو بعد میں سوچنے کی ہیں پہلے اُسے تو دیکھو وہ پٹڑی کے قریب کتنے دھڑلے سے بیٹھ گئی ہے۔" جگنی کے اصرار پر جگنو نے دیکھا پھر یکدم ہی وہ چونکا۔

"ارے وہ تو پٹڑی پر لیٹ گئی ہے۔" "کیا کہہ رہے ہو؟" جگنی بھی گھبرا کر اڑی۔

"یہ پٹڑی کے بیچوں بیچ کیوں لیٹ گئی ہے اور یہ اتنی بے بسی سے درخت کے پاس رکھی گٹھڑی کو کیوں تک رہی ہے؟" جگنی نے فکر مندی سے جگنو کی طرف دیکھا۔

"میں خود دیکھتی ہوں" جگنی اضطراب کے عالم میں بولی اور اڑ گئی جبکہ جگنو اس کے پیچھے پیچھے۔۔۔

"کچھ دیکھا تم نے' گٹھڑی نہیں' یہ تو چادر میں لپٹا معصوم سا بچہ ہے۔" جگنی کپڑے میں لپٹے وجود کے اردگرد چکر کاٹتے ہوئے جگنو سے مخاطب ہوئی' پھر یکدم ہی اس کے دماغ میں بجلی سی کوندی اور وہ چمکتے ہوئے پٹڑی کی طرف پلٹی۔

"یہ لڑکی تو خودکشی کرنے جا رہی ہے' ارے جاؤ جلدی سے دیکھو تو پلیٹ فارم کے پاس کوئی گاڑی تو چلنے کو تیار نہیں" جگنی نے جلدی سے جگنو کے پروں کو آہستہ سے چھوتے ہوئے آمادہ کیا۔

"میں ابھی آتا ہوں" جگنو اڑ چکا تھا جبکہ جگنی کرب اور بے چینی کے عالم میں پٹڑی کے بیچوں بیچ سسکتا وجود تک رہی تھی۔ "ارے کیسی ماں ہے؟" اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اس لڑکی کو جھنجوڑ دے' آسمان پر ٹمٹماتے تارے بھی مایوس نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ جگنی عالمِ اضطراب میں اِدھر اُدھر چکر کاٹ رہی تھی' اس کے وجود سے پھوٹتی روشنی اندھیرے میں ننھی کرن کی طرح پھیلنے پر مصر تھی' ایسے میں جگنو پہنچ گیا۔

"کچھ تو کرنا پڑے گا' ٹرین چلنے کو تیار ہے" جگنو نے پریشانی سے جگنی کو مخاطب کیا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو؟" جگنی بے ساختہ بولی۔ اچانک جگنو پٹڑی کے قریب آیا اور کان پٹڑی پر لگائے پھر یکدم ہی ہوا میں اڑا۔

"ٹرین چل چکی ہے" چل یہاں سے پیاری اب ہم کچھ نہیں کر سکتے" جگنو نے دایاں پَر آنکھوں پر رکھتے ہوئے کہا۔

"میں کچھ تو کر سکتی ہوں۔۔۔ کچھ تو۔۔!" ہوا میں دائرے کی صورت چکر کاٹتی جگنی اچانک درخت کے نیچے پڑے معصوم وجود کے قریب آئی اور آہستگی سے اس کے نازک چہرے پر نرمی سے اپنا پر مارا اور پھر خوفزدہ سی درخت کی اوٹ میں چلی گئی' اچانک ہی رات کی تاریکی کا گلا گھونٹتی ایک معصوم سی چیخ فضا میں گونجی اور پھر چیخوں کا تسلسل بنتا چلا گیا' بچہ شدت سے رو رہا تھا' جگنی نے مسکرا کر جگنو کو دیکھا' پٹڑی پر پڑا وجود اب بھی ڈگمگا رہا تھا' ریل کی کھٹر پٹر اب قریب سے سنائی دے رہی تھی' جگنو بھی قریب آتی ریل سے ڈر کر درخت کے پیچھے آ گیا تھا' اب دونوں درخت کی اوٹ سے دیکھ رہے تھے۔

"کیسی ماں ہے اپنے بارے میں ہی سوچ رہی ہے" جگنو نے تڑپ کر کہا۔

"نہیں یہ ماں ہے۔۔۔۔! جانتے ہو نا لفظ ماں میں کتنی طاقت ہوتی ہے تو۔۔۔۔۔ یہ تو۔۔" لیکن قریب آتی ٹرین کو دیکھ کر جگنی کے الفاظ گلے میں گم جبکہ چیخ فضا میں بلند ہوگئی' وہ ہوا میں بے قابو ہو کر شاخ کی بانہوں میں جھول گئی' بچے کی بلند ہوتی چیخیں اس کا دل دہلا رہی تھیں' اچانک ہی برق رفتاری سے وہ عورت اٹھی' ماں کی ممتا اس کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی' تیزی سے اس نے بچے کو گود میں اٹھایا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ کبھی بچے کو چوم رہی تھی اور کبھی پٹڑی پر دوڑتی ریل کو تک رہی تھی' تھکی ہاری جگنی نے جگنو کے بازو پر اپنا سر ٹکا لیا جبکہ دور پیپل کے بڑے سے درخت کی اوٹ سے صبح کی پہلی کرن جھانکتے ہوئے مسکرا رہی تھی۔

انٹرویو

عائشہ مشعل

صبح صبح سورج کی پہلی کرن جب کھڑکی کے پردے کو چیرتی ہوئی اُس کے خوبصورت اور معصوم سے چہرے پر پڑی تو اس پر مسکراہٹ نمودار ہوئی نکھر اور بھی بھلا لگنے لگا۔ رنگ شہابی' ہونٹ گلابی' پلکیں جیسے تلواریں' شیو تھوڑی بڑھی ہوئی مگر خوش نما معلوم ہو رہی تھی۔ ہر ادا سے معصومیت ٹپک رہی تھی۔ شاید یہ معصومیت ہی اس کی اصل خوبصورتی کی وجہ تھی۔ اتنے میں الارم تیسری بار بجا اس الارم نے تو جیسے اس حسین مکھڑے کی تمام راعنائیاں ہی چھین لیں ہوں گھبراہٹ میں وہ جلدی میں بستر سے اُٹھا۔۔۔۔

دوسری طرف عین اُسی وقت رابعہ سفید یونیفارم میں ملبوس ناشتے کی ٹرے تھامے کمرہ میں داخل ہوئی اور تیکھے لہجے میں گویا ہوئی!

کیا بھیا۔۔۔! آپ آج بھی لیٹ اُٹھ رہے ہیں بہت بار کہا ہے کہ رات کو جلد سویا کریں۔

راس پیار سے کہنے لگا۔۔ رابی! مجھ سے چھوٹی ہو کر بڑی بننے کی کوشش مت کیا کرو۔ بلکل دادی اماں جاں کی Look دیتی ہو۔ مجھے معلوم ہے آج پھر تمہیں کالج کے لیے جلدی روانہ ہونا ہے۔ فکر مت کرو آج میرا بھی انٹرویو ہے میں تھوڑی دیر تک تیار ہو کر لان میں آتا ہوں پھر اکٹھے نکلتے ہیں۔

راس اتنا کہہ کر خود تو باتھ روم میں گھس گیا مگر رابعہ جس کے چہرے پر شوخی و شرارت کا گمان تھا انٹرویو کا لفظ سنتے ہی بجھ سی گئی۔ ناشتے کی ٹرے ٹیبل پر رکھ کر باہر لان میں رکھے بید کے میز اور کرسیوں میں سے ایک کرسی پر گم سم بیٹھ گئی گویا بہت ضبط سے اپنے آنسوؤں کو تھامے بیٹھی ہو۔

رابعہ کے دماغ میں پچھلے سال کی یادیں گردش کر رہی تھی وہ بھی ایسا ہی دن تھا جب راس کو انٹرویو کے لیے جانا تھا مگر بدقسمتی سے راستے میں اوباش لڑکوں کے ہتھے چڑھ گیا۔ شراب کے نشے میں چور اُنہوں نے راس سے موبائل اور نقدی چھین لی پھر مار مار کر اس کی حالت غیر کر دی۔ راس کی ایسی حالت دیکھ کر انکی ماں کو دل کا عارضہ لاحق ہو گیا اور وہ اس دُنیا سے چل بسی انکے والد پہلے ہی ایک حادثے میں اپنی جان گنوا بیٹھے تھے۔

اچانک اپنی پشت پر کسی کا ہاتھ محسوس کرتے ہوئے رابعہ کی سوچوں کا تسلسل ٹوٹا۔۔۔ یہ راس تھا جو شفقت سے پوچھ رہا تھا کہ!!!!! آج میری پیاری بہن کی تمام شرارتیں کہا ہیں کیوں گم ہو راس کی آنکھیں محبت کا درس دے رہیں تھیں جبکہ رابعہ کی آنکھوں میں بے چینی و بے قراری تھی ایسی بے چینی و بے قراری جو چھپائے نہ چھپتی۔۔۔

راس اپنی بہن کی پریشانی بھانپ چکا تھا اور اُسے دوبارہ خوش کرنے کے لیے اٹکھیلیاں کرنے لگا اور بولا۔۔۔ محترما اب چلے کہ آپکو مزید شرارتوں کی تخلیق کے لیے گھر چھوڑ دیا جائے۔

(اتنا کہ کر راس نے موٹر بائیک کی طرف چہل قدمی کی)

رابعہ پھرتی سے بیگ سنبھالتے ہوئے بولی رُکیں' رُکیں!!! میں بھی جاؤں گی۔

بھائی کے پیچھے لپکی اور پھر بولی' بھیا! آپ ہمیشہ مجھے تنگ کرتے ہو۔ راس بائیک چالو کرتے ہوئے قدرے چڑانے کے موڈ میں کہنے لگا' اب بیٹھو جلدی! پھر کہو گی بھیا۔۔۔ آپ ہمیشہ مجھے دیر سے کالج پہنچاتے ہو۔۔۔ بہن سنبھلتی ہوئی سوار ہو گئی۔ دونوں روز کی طرح گھر سے نکلے۔ رابعہ کا کالج ۲۰ منٹ کی مسافت پر تھا والدین کے انتقال کے بعد یہ دونوں اسی طرح ایک دوسرے کے دُکھوں کا مداوا کرتے آرہے تھے۔

رابعہ: بھیا۔۔۔! پلیز پلیز پلیز۔۔۔! آج مجھے وقت پر گھر واپس لے جایئے گا۔ کیونکہ شام کو میری دوست کی سالگرہ ہے وہاں جانے کی بہت تیاری کرنی ہے۔

راس: (ذرا شوخی سے رابعہ کو تنگ کرتے ہوئے) لو پھر رابی! آج تو میں لازمی لیٹ ہوتا ہوں تا کہ تمہاری تیاری ادھوری رہ جائے اور تم میک اپ کے بغیر اُدھر جاؤ۔۔۔۔! (پھر ہنسنے لگا)

رابعہ کو غصہ آیا کچھ کہنے کو ہی تھی کہ کالج کی

گھنٹی کی آواز نے اسے زچ کر دیا۔ رابعہ گیٹ کی طرف لپکی۔ رامس بھی اب تک آگے بڑھ چکا تھا۔

تھوڑے فاصلے پر رامس کا آفس تھا جہاں انٹرویو کے لیے جانا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ اس بار کامیاب لوٹے گا۔ بھرپور اعتماد کے ساتھ رامس کمرے میں داخل ہوا مگر اُدھر Boss کے بجائے اجنبی آدمی کو نشست پر براجمان پایا۔ آدمی لڑکے کے اعتماد کو جانچتے ہوئے بولا: کیا خیال ہے برخودار تمہیں یہ نوکری دے دی جائے۔

رامس: (جوشیلے انداز میں سلام کے بعد مہذب لہجے میں بولا) جی بلکل سر میں اسکا حقدار ہوں میرے امتحانی درجات اس کی اجازت دیتے ہیں اور اگر یہ نوکری میرے لیے نہ ہوتی تو آپ مجھے لیٹر کیوں بھیجے۔۔۔!

آدمی: (کمینگی سے ہنستے ہوئے) یہ ہی تو مجھ سے غلطی ہوئی کہ میں نے تمہیں لیٹر بھیج دیا۔

رامس: (ہچکچاتے ہوئے) غلطی۔۔۔ کیا مطلب سر میں کچھ سمجھا نہیں۔

آدمی: دیکھو رامس ہمیں اس نوکری کا Candidate مل چکا ہے۔ امیدوار کیا میرا اپنا بھتیجا ہے۔

رامس: (غصے سے) تو یوں کہو نہ کہ تم Boss کی آنکھوں میں دھول جھونک رہے ہو۔۔۔ مجھے تو پہلے ہی شک تھا تیرے جیسا کمینہ انسان کوئی اچھا کام کر ہی نہیں سکتا۔ میں آج ہی کمپنی کے مالک سے بات کرتا ہوں وہ پہلے تو تمہیں یہاں سے فارغ کریں گے کیونکہ اگر تم جیسوں کی ضرورت نہیں۔۔۔

آدمی: (تھوڑا پریشان ہوتے ہوئے) دیکھو رامس ضد نہ کرو تم کسی دوسری جگہ Apply کردو۔ ورنہ یہ مت بھولو کہ تمہاری ایک جوان بہن بھی ہے

اس بات نے تو جیسے جلتی پہ تیل کا کام کیا رامس آگ بگولہ ہو گیا اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا بغیر کچھ سوچے میز پر پڑے گلاس کو توڑ کر ایک نوکیلے ٹکڑے سے آدمی پر حملہ کر دیا۔

آدمی کی لاکھ مزاحمت کے باوجود رامس نے گلاس کے نوکیلے ٹکڑے کو آدمی کے سینے میں گھونپ دیا۔ کمرہ ایک خوفناک چیخ سے گونج اٹھا اس آواز کے پیشِ نظر لوگوں کا ایک ہجوم بن گیا۔ کسی نے پولیس کو اطلاع دے دی آدمی کب کا زمین پر تڑپ تڑپ کر مر چکا تھا۔ رامس کا دماغ ماؤف ہو چکا تھا اسکو اپنے اردگرد کی کوئی خبر نہ تھی۔ جب پوری طرح ہوش آیا تب وہ اپنے ہاتھوں میں ہتھکڑی کا وزن محسوس کر سکتا تھا۔ پولیس کے دو آدمی دھکیلتے ہوئے رامس کو گاڑی میں ڈھال رہے تھے اور اُسکی آنکھوں سے آنسوؤں کی ندیاں بہہ رہی تھیں۔۔۔ دوسری طرف رابعہ کالج سے فارغ ہو چکی تھی اور ایک سیمنٹ کے بینچ پر بیٹھی آنکھوں میں بے چینی و بے قراری لیے اپنے بھائی کی راہ تک رہی تھی۔

اے یادِ یار اجازت چاہتی ہوں
کوئی تازہ محبت چاہتی ہوں
نپٹنے ہی نہیں ہیں کام گھر کے
ذرا سی دیر فرصت چاہتی ہوں
نہیں بھاتی یہ خال و خد کی زردی
گلابوں جیسی رنگت چاہتی ہوں
ہوائے وصل تھوڑی دیر ٹھہرے
بس اتنی سی رعایت چاہتی ہوں
اے کوزہ گر ادھر ہے خاک میری
میں ہونے کی عنایت چاہتی ہوں
میں تنہائی سے عاجز آ گئی ہوں
صداؤں کی میں وحشت چاہتی ہوں
یہ بستی گونگے بہروں کی ہے لبنیٰ
میں نغموں کی سماعت چاہتی ہوں

لبنیٰ صفدر/ پنڈی بھٹیاں

تیری صورت کو دیکھ کر جینا
تیرے ملنے کی آس پر جینا
آفتوں اور مصیبتوں کے ساتھ
کتنا مشکل ہے چشم تر جینا
صبح سے شام تک سفر کرنا
اور پھر غم میں رات بھر جینا
زندگی اک سراب لاحاصل
عمر بھر ہے اِدھر اُدھر جینا
موت کو اپنا ہم سفر جانو
خوب تر چاہتے ہو گر جینا
موت کی جستجو میں کیوں ہیں لوگ
اتنا آسان ہے اگر جینا

لبنیٰ صفدر/ پنڈی بھٹیاں

”......باقی سب خیریت ہے!“

رابنسن سیموئل

چند دن گزرے والد صاحب کی الماری کو سنوارتے ہوئے پرانے خطوط کی ایک فائل مل گئی۔ ان پر یونہی سرسری نگاہ ڈالی تو ایک دل چسپ خط سامنے آ گیا جو اُن کے والد صاحب یعنی میرے دادا جان کے پرانے دوست نے سرگودھا سے انہیں ارسال کیا تھا۔ اُسی خط کے متن کو مَیں نے ”... باقی سب خیریت ہے!“ کا عنوان دے کر مضمون میں ڈھال لیا۔ تو ذرا خط ملاحظہ کیجئے۔

”بیٹا، مَیں خُدا تعالیٰ کے فضل و کرم سے بالکل خیریت ہوں۔ بس بڑھاپے کی وجہ سے صحت اتنی اچھی نہیں رہتی، باقی سب خیریت ہے۔ یہ شوگر اور بلڈ پریشر کا مسئلہ تو ہر دوسرے بندے کو پریشان کئے ہوئے ہے۔ بھلا تم ہی بتاؤ آج کے دور میں ٹینشنیں کم ہیں؟ پہلے اپنے والدین، بہن بھائیوں کی ٹینشن، پھر اپنی شادی کی ٹینشن، پھر بچے اور اُن کی پرورش اور تعلیم کی ٹینشن، پھر اُن کے لئے اچھی نوکریوں اور اچھے رشتوں کی تلاش، اور جب شادیاں ہوگئیں تو تب بھی پریشانیاں ختم نہیں ہو جاتیں۔ شکر ہے کہ تو بچے تو اپنے اپنے گھروں کے ہوگئے۔ بس اب دو رہ گئے ہیں۔ ان کے بھی اچھے رشتے ملے تو جلدی اس ذمے داری سے بھی فارغ ہو جاؤں گا۔ اَب بھلا ایسے بندے کا بلڈ پریشر ہائی نہ رہے تو اور کیا ہو؟ لیکن باقی سب خیریت ہے۔ بلڈ پریشر کی دوائیاں استعمال کرتا ہوں جس سے افاقہ ہوتا ہے۔

یہ خط لکھنے میں خاصی دقت ہو رہی ہے کیونکہ بینائی آہستہ آہستہ کم ہوتی جا رہی ہے۔ عینک کا نمبر بھی جلد تبدیل کرواؤں گا۔ ویسے ڈاکٹر نے کہا ہے کہ شوگر ہائی رہنے کی وجہ سے بینائی پر اثر پڑ رہا ہے، دانت بھی بس چند ایک ہی باقی بچے ہیں یہ بھی شوگر جیسی نامراد بیماری کا ہی کیا دھرا ہے۔ پھر بھی سب باتوں کے لئے خُدا کا شکر ہی کرتا ہوں۔ یہ تکلیفیں، بیماریاں، دُکھ وغیرہ فانی چیزیں ہیں۔ انسان کو ہمت نہیں ہارنا چاہیے، مَیں بھی مایوس نہیں ہوتا۔ تو بھی شوگر جیسی بیماری بندے کو نڈھال کر دیتی ہے۔ ڈاکٹر نے تو کہا ہے کہ میرے گردوں پر بھی اثر پڑ رہا ہے لیکن خدا کا شکر ہے کہ باقی سب خیریت ہے۔

ریٹائرمنٹ کے بعد سے اور خصوصاً پچھلے سال دو بیٹیوں کی شادی کرنے کے بعد مالی مشکلات بھی خاصی بڑھ گئی ہیں۔ بچے اپنے اپنے گھروں کے اخراجات پورے کر لیں تو وہی بڑی بات ہوگی۔ مَیں اُن پر مزید بوجھ ڈالنا پسند نہیں کرتا بس جو تھوڑی بہت پنشن ملتی ہے اُسی میں گزر اوقات کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ بعض اوقات تو ایسے حالات ہوتے ہیں کہ دوائی خریدنے کے بھی پیسے نہیں ہوتے، باقی سب خیریت ہی ہے۔

بس بیٹا، آج سوچا کہ خط لکھ کر تمہارے ساتھ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لوں۔ کوئی مہینہ بھر سے پیٹھ پر ایسا پھوڑا نکلا ہے کہ بیٹھنا بھی دُوبھر ہو گیا ہے۔ اُس کا بھی حکیمی علاج کروا رہا ہوں۔

مَیں نے تمہیں شکریہ کہنے کے لئے خط لکھا تھا کہ جو ہزار روپے کا تحفہ تم نے اپنے انکل کے لئے بھیجا تھا، وہ مل گیا اور بڑے مشکل وقت میں کام آ گیا۔ کیونکہ تمہاری آنٹی بھی بڑی بیمار تھی۔ شوگر، بلڈ پریشر کی تو چلو خیر تھی اُسے دمہ بھی ہو گیا تھا۔ بس جب تمہارے بھیجے پیسے ملے، اُسی روز تمہاری آنٹی اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملی۔ مجھے تنہا چھوڑ گئی۔ مَیں نے سوچا کہ چلو اس خط میں تمہیں اطلاع دے دُوں کہ تمہاری آنٹی بھی فوت ہوگئی، باقی سب خیریت ہے۔ بس ہر ایک کو اپنی اپنی باری پر اس دُنیا سے جانا ہے۔ کسی کو پہلے اور کسی کو بعد میں۔

بس اب مَیں اکیلا ہی اس دُنیا میں رہ گیا ہوں۔ میرے بلڈ پریشر، شوگر، بینائی، گردوں اور اس نامراد پھوڑے کے لئے دُعا کرتے رہنا جو ابھی بھی بڑا تنگ کر رہا ہے۔ باقی سب خیریت ہے۔ گھر میں سب کو سلام دینا۔

فقط تمہارا انکل...

چہ ماہی **لیکھ** لاہور
ایڈیٹر ڈاکٹر ناصر رانا
قیمت فی شمارہ: 400 روپے
....
سہ ماہی **ادبِ معلّیٰ** لاہور
ایڈیٹر ڈاکٹر ناصر رانا
قیمت فی شمارہ: 1250 روپے
دی اکیڈمکس (رجسٹرڈ)
N-391 نیو مارکیٹ، سمن آباد، لاہور
فون: 0345-4104654

افسانہ

جوگ آس

سمیرا احمد

اور شاید اس سے ایک غلطی ہوئی کہ وہ اسے مٹھی میں دبا کر ساتھ لے آیا...... نہ سر سے اچھالا نہ پاؤں سے مسلا اور ہریالی کے سارے ٹھکانے جو اس کے اندر پیوند تھے وہ چتا کی لکڑیوں کی طرح سلگنے لگے۔اور اس کے گھر کی روشنیاں کم سے کم ہوتی گئیں کہ آخری وقت اسے دیواریں ٹٹول کر چلنا پڑا یہ سب تین دن بعد ہوا اور تین دن پہلے دیواریں ٹٹولتے ہی وہ اس دہلی دروازے سے پار ہوا۔ جن گلیوں میں وہ گھس آیا تھا ان میں بہت اندھیرا تھا یا اسے ہی زیادہ روشنیوں میں رہنے کی عادت ہو چکی تھی کہ وہ ایک دیوار کا سہارا لے کر بھی لڑکھڑا گیا اور یہ تیس سال بعد ہوا......

یہ راز بہت بعد میں کھلا کہ یہ بھی کوئی راز ہی تھا۔

وہ آیا وہ آئی...... اور بس...... اگرچہ بعد کے دنوں میں اس قصے کو نت نئے اندازوں سے سنایا گیا جیسے کہ کوئی لوک کتھا...... جو ہر زبان پر پہنچ کر اس زبان والے کی من مرضی کی ہو جاتی ہے۔

پہلی بار اس نے ماں کو محرابی جھروکے میں کھڑے دیکھا اور اسے لگا راجپوتوں کی کوئی کنیز دم بھر کے لیے سورج کو اپنا نظارہ کروا رہی ہے۔وہ اس کی ایسی فیاضانہ ادا پر دم بخود رہ گیا۔

یہ کون ہے؟ اس نے ساتھ چلتے پھوپھی زاد طیب سے پوچھا

یہ؟ ماں ویدی ہیں۔

ماں بھی اور ویدی بھی؟ ہیں کون۔کس چچی ،پھوپھی، خالہ، ممانی کی اولادیں دلیرانہ پروان چڑھی ہے کہ یوں تصویر کی طرح محراب میں جڑی ہے۔ایسی جرات سے کسی بانکے کو کھڑے نہیں دیکھا کیا بانکی۔میں یہ نکتہ سمجھ نہیں پا رہا۔

کوئی گناہ کر رہی ہیں کیا؟ طیب نے دانت نکالے

گناہ کروا رہی ہیں......

آپ کو تو عادت ہے ہر لڑکی کے لیے گناہ سر پر لینے کی......

تمہیں عادت ہے میرے سارے گناہ یاد رکھنے کی......

مشکل سے پانچ دن نہیں ہوئے آپ کو یہاں آئے ہوئے اور دو عدد خطوط میں آپ کے تکیے کے غلاف سے برآمد کر چکا ہوں اور ایک چھت کی مٹی سے۔معاف کیجیے گا ریشمی رومال کی آخری سطر میں نے بندہ نفس سے مجبور ہو کر پڑھ لی تھی۔لگتا ہے محترمہ کے ابا حضور مشاعروں میں کثرت سے شرکت کرتے ہیں اور پھر گھر آ کر محفل جمانے کے شوقین ہیں۔اور میری ذہانت پر داد و تحسین عنایت فرمائیے میں نے ان کے چوبارے سے جھانکتی ساری نسوانی بیلوں کو دیکھ کر اندازہ لگا لیا کہ یہی ہے وہ گھر جہاں سے مشاعرانہ رومال کا نزول ہوا ہے۔بجا فرمایا نا میں نے؟

''تم ذرا خاموش رہو......'' طیب کی آواز بار بار اسے الجھا رہی تھی۔

وہ جھروکے سے ہٹی ستون کے ساتھ بل کھانے لگی اور اس بار نظر کرم اس نے آسمان کی اور کی اور اسے ایسے دیکھنے لگی جیسے وہاں سے کسی خاص مہمان کی آمد متوقع ہو۔یعنی اسے زمین والوں سے کچھ لینا دینا ہی نہیں۔عالی نے آہ بھری کہ یہ کیسی ناانصافی ہے۔

اور پھر جب وہ وہاں سے ہٹی تو اسے اندازہ ہوا کہ وہ کتنی روشنی اپنے اندر سموئے وہاں کھڑی تھی۔یہ اندازہ بہت بعد میں بھی ہوا کہ وہ کیا کچھ لیے ہوئے تھی۔کھڑی تھی، بیٹھی تھی، چلتی تھی، رکتی تھی، روک لیتی تھی اور ان سب کے ساتھ قائم رہتی تھی لیکن بہت کچھ تو ہلا ڈالتی تھی نا۔

شادی کا گھر تھا لاکھ پردے کا اہتمام ہوا کرتا لیکن آمنا سامنا ایسے تو ہو ہی جاتا کہ معلوم پڑتا بانکے بھی آئے ہیں اور بانکیاں بھی۔چھیلے بھی ہیں اور چھبیلیاں بھی۔بانکی چھبیلی وہ ڈھیر سارے کپڑے لپیٹے کبھی کسی بالکنی میں کھڑی دکھتی، کبھی کسی ستون سے لپٹی ملتی اور کبھی دالانوں سے فرشی سلام لیتی پائی جاتی۔اور وہ اتنا فارغ تھا کہ سارے ماموں ،چچاؤں ،چھوٹے بڑے ہر طرح کے اباؤں کی گھوریوں کو نظر انداز کرتا ان مندروں کی گھنٹیاں بجایا کرتا جن میں درشن کو وہ میسر ہوتی۔

لیکن ایسے نہیں کہ نظریں چار ہو جائیں۔بس کسی نہ کسی کی اوٹ سے ہے۔چچیوں اور کھڑکیوں میں کھڑے ہو کر وہ اسے ان ستونوں، احاطوں، دالانو ں میں صنف نازک کے جلوس میں علمبردار بنے دیکھتا۔جہاں گھیر داروں کی جان پڑتال ہو رہی ہوتی، کناریاں تنگ رہی ہیں اور ہرے بھرے پتے سل بٹے پر رگڑ رگڑ منہ پر لیپے جا رہے ہوتے۔وہ بھی آنکھ اٹھا کر اوپر دیکھ لیتی اور پھر اس کے ہونٹوں کے

کنارے ایسے وا ہوتے جیسے کہتی ہو۔" اچھا جناب تو ایسے باز نہیں آئیں گے۔" اور کسی خالہ، پھوپھی، بے جی کو روک کر اُوپر کی اور اشارے کرتی جانے کیا کیا بتاتی تو وہ دانت پر دانت جماتا دبک جاتا اور اس کے نتھنوں پر جی جان سے چڑھ جاتا اور من ہی من کہہ اٹھتا

" اچھا جناب تو ایسے باز نہیں آئیں گی آپ بھی۔"

یہ کون ہے؟ طیب پھر سے پیچھے کھڑا دانت نکال رہا تھا اور وہ اس بار سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔

کسی اور سے کیوں نہیں پوچھ لیتے...... بلکہ انہی سے۔طیب کی ہنسی معنی خیز تھی

تمہیں کس دن کے لیے تیل پلایا ہے۔

لیکن یہ چراغ آپ کے ہاں کے تیل سے نہیں جلے گا......

کیوں؟ اسے انکاری کی ساری ہی توجیہات بہت بری لگتیں تھیں۔

یہ تھالی اور سندور کی پرجاتی سے ہیں۔ پھوپھی اماں ان کی ماتا کی سہیلی ہیں خاص دہلی سے لے کر آئی ہیں آپا رقیہ کی شادی کے لیے۔دیکھ لیجیے بھائی صاحب یہ ہندوستان نہیں جس کے ٹکڑے کر کے آپ کے ہاتھ آپ کا حصہ تھما دیا جائے گا۔

" کم بخت منہ سے خرافات ہی نکالنا" بڑے چچا کا گزر ہوا قریب سے تو طیب کی بات سے بھڑک اٹھے

کیوں ہوں گے ٹکڑے...... چل آ تیرے کروں ٹکڑے......

بڑے چچا کانگریس کے حامی تھے۔مزاج اتنا بگڑا کہ طیب کو حلوائی کے ساتھ سامان اٹھوانے میں لگا دیا جو بے چارا پھوپھی اور پھوپھیریوں کے دوپٹے رنگوانے جاتے سو سو بہانے بناتا تھا کہ ہم سے نہیں ہوتا اتنا کام۔

سفید اونچی دیواروں سے رنگین آنچل ٹکرایا کرتے تو دم بھر کو اسے لگتا کہ اڑتا ہوا یہ آنچل اس کے ہاتھ آیا کہ آیا۔

بالائی منزل میں موجود بلکہ قید مردانے میں دم سادھے ہو جاتی جب نت نئے راگ ڈھولک پر گائے جاتے۔آگرے کے پھوپھا حقہ گڑگڑاتے گاؤ تکیے کو سہارا بنائے ذرا کی ذرا چونکے۔

یہ کون گا رہا ہے۔؟ سرگوشی کی طیب کے کان میں مبادا کوئی یہ جان نہ لے کہ وہ ایسے کان لگا کر سن رہے ہیں۔

" وہی جن کے لیے آپ کہتے ہیں گھٹی میں ناچ گانا چاٹتے ہیں۔"

" اچھا تبھی۔"

حقے گڑگڑاتے، پان چباتے، حیدر آبادی چٹکلے چھوڑتے مردانے کے سب مرد سو جاتے تو وہ چپکے سے ابا سے نظر بچا کر جو آنکھیں تو موند لیتے پھر بھی اُوں آں کرتے رہتے اُوپر چھت پر آ جاتا اور نیچے چلمن پوش دالانوں کو جو اٹکھیلیوں سے دہک رہی ہوتیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا۔جو دکھائی دیتا وہ سنائی نہ دیتا۔وہ نیچے آتا سنتا اور پھر دیکھنے کے لیے اوپر پہنچ جاتا۔

یہ ٹھمری ہے...... گیت...... کہ بھجن......

وہ سنتا جاتا، سوچتا جاتا۔پھر دبے پاؤں نیچے آتا اور سوچتا کہ سب تو ڈھولک گرد بیٹھی ہیں کہیں سے کسی کونے میں گھس جائے اور دیکھے کہ قریب سے دیکھنا کیسا ہے۔

تم سوئے نہیں ابھی تلک؟ کوئی نا کوئی بوا، چچی، ماسی سر نکال پوچھتی۔

یہ ماسیاں، چچیاں، بوائیں اتنی زیادہ کیوں ہوتی ہیں۔ہوتی بھی ہیں تو جلد سوتی کیوں نہیں۔بلیوں کی طرح کہیں سے بھی میاؤں کر دیتی ہیں۔

" کان میں درد ہے۔تیل لینے آیا ہوں۔اماں جی کہاں ہیں؟

اماں تو سو گئی تمہاری۔کان میں درد ہے تو بچے ہو کیا جو تیل ڈالوں گے...... جاؤ جا کر سو جاؤ۔

" درد میں نیند کسے آتی ہے...... درد دینے والوں کو ہی آتی ہو گی...... سہنے والوں کو تو نہیں ......" اس نے ذرا سر کو اٹھا کر کہا کہ کوئی تو سن لے

اور سن لیا گیا کہ چلمن کے پار ڈھولک پر تھاپ رک گئی۔گانے والی کی آواز بھی۔

"کون دکھیارا راگ الاپ رہا ہے موسی؟" ڈھیروں کپڑوں میں لپٹی نے ڈھیروں کانچ سے بجے ہاتھ کو جیسے آج ہی مہندی سے رنگا تھا اِدھر موسی کی طرف اٹھا کر پوچھا۔

گیت گانے والیاں کیا گیت ہی بولتی ہیں؟ چلمن سے اس نے اس کی مسکراتی آنکھوں کو دیکھ کر سوچا۔

باقی لڑکیاں ہنسی سے دہری ہونے لگیں اور اس کو اس کی جرات پر داد دینے لگیں۔

"اب کیا تیل کے لیے بھی وائسرائے کے پاس جاویں اور کھوویں۔" وہ بوا سے چڑ گیا۔

ٹھہروں لاتی ہوں پر کہے دے رہی ہوں دوبارہ کان میں درد لے کر نہ آنا۔تین دن سے یہ درد لیے تمہیں آتے اور جاتے دیکھ رہے ہیں بابو۔تمہاری اماں کے کان میں بات ڈال دی ہے۔اب ذرا صبری

سے رہو۔کل پوچھا تو کہہ رہی تھیں ابھی نہیں کروں گی اس کی، کام وام تو کوئی کرتا نہیں۔

بوا نے ایسا کوئی چٹکلہ تو نہیں چھوڑا تھا لیکن ڈھولکی کی ساری پلٹن ہنس ہنس کر اوندھی ہوگئی۔

اگلے دن ناشتہ ملا، کھانا ملا، نہانے کا سامان اور اعلان ملا کہ تیل ماچس رکھوادی گئی ہے کمرے میں ۔راتوں کو نیچے آنے کی زحمت نہ کیجیے۔ٹھنڈ لگ گئی تو ہم سے تیمارداری نہ ہوگی۔

ہونہہ اسے کیا ضرورت تھی نیچے آنے کی۔اتنا تو اب اس نے کرہی لیا تھا کہ تین اطراف کی چھت کو گھوم پھر کر اس نے وہ سارے کونے تلاش لیے تھے جہاں سے گیت بولنے والی دکھائی دیتی تھی۔سنہری دھوپ میں جھولا جھولنے والی، پان کی گلوری دکھا دکھا کھانے والی، سر موڑے پیروں کے ناخنوں پر مہندی لگانے والی، کسی ریشمی جھلمل کو سر پر اوڑھتی ہوئی اور سر اٹھا کر چھت کے کسی کونے کی درز کو رکتے ہاتھوں پکڑ کر اور پھر "اچھا بچو! تو یہ آپ ہیں۔" آنکھوں میں سمو کر پھر پھر اچھالنے والی۔

☆ ☆ ☆

اوپر کہیں سے کچھ آ کر گرا۔تلملا کر اس نے سر اٹھایا اور گندی سندی دیواروں، کھڑکیوں، چھجوں کو گھور کر رہ گیا لیکن کچھ بھی قابل ثبوت نہ ملا کہ کس نے سر نکال کر یہ حرکت کی۔کراہیت سے وہ جل بھن گیا۔یہ تھوک تھا جو اس کی پیشانی پر پڑا تھا۔رومال سے پیشانی رگڑتے اس کے اندر ابال آیا کہ وہ یہاں کیوں آیا ہے۔اب تک تو اس نے کبھی رتی برابر بھی یہ کوشش نہیں کی تھی کہ ٹوٹے بکھرے قافلوں کی صورت ہجرت پر نکلے خاندان کو پالے۔وہ رنگین برجتوں کا دلدادہ تھا باسی پن سے اسے اکتاہٹ ہوتی تھی۔اماں ابا ہجرت سے دعا کرتے بہت جلد اپنی روحیں لیے اس پار جا پہنچے اور ہجرت سے باغی ہوئے۔پھر یہاں آئے ہی کیوں تھے۔چند بار اسے خطوط ملے کہ میں تمہارا فلاں ابن فلاں ہوں اور تم میرے فلاں ابن فلاں لگتے ہو۔

"تو میں کیا کروں"۔وہ خط کو کہیں بھی اچھال دیتا۔

جو حویلی اس نے ان دنوں اپنے نام الاٹ کروا لی تھی وہ اسے ہوٹل بنانے میں مصروف تھا۔اب وہ اس کی دیکھ ریکھ کرتا یا ان فلاں ابن فلانوں کی۔ویسے بھی پرانا دستور جو بھی ہوا کرے وہ تو نیا دستور رقم کر رہا تھا۔

کیسا خوبصورت دستور رہا ہے شادی کے گھر آنگن میں مہینوں پہلے قافلوں کے اترنے کا۔علی گڑھ سے کچھ اور مہمان آرہے تھے۔مردانے کو ذرا خالی کروایا گیا اور لڑکیاں آئیں بستر اور جانے کیا کیا اٹھا کر اوپر رکھنے۔وہ عین وقت پر پردے کے پیچھے کمال مہارت سے چھپ گیا۔اوپر سے نیچے جھانکتے پہلے ہی تاڑ گیا تھا کہ بانکیوں کی آمد اوپر متوقع ہے۔

اور پھر جب صاف شیشیوں کی لالٹینیں رکھ دی گئیں۔انگیٹھیوں کی پرانی راکھ کو کوئلوں سے بدل دیا گیا اور طاقوں کو چراغوں سے سجا دیا گیا تو وہ یہاں وہاں اپنے ڈھیروں کپڑوں کو اپنے ساتھ گھسیٹتی گلاب پاش سے فضا کو معطر کرتی نیچے جاتے جاتے رہ گئی ۔باقی سب جاچکی تھیں ایک اسی کا کام رہ گیا تھا۔

وہ اوٹ سے نکل آیا اور وہ گلاب پاشی کرتی ایڑی کے بل گھومتی اس کے سینے سے آ لگی......

"اوئی ماں" اس کے منہ میں ہی رہ گیا۔دہن وا ہوا اور آنکھوں نے پہچان سے کچھ یوں کہا۔"اچھا بچو! تو یہ آپ ہیں۔"

"کیوں نا ہوتا" اس نے لفظ لفظ کہا۔آواز سے کہا کہ یاد تھا وہ کس تفاخر کو لیے پہلی بار کھڑی پائی گئی تھی۔

تفاخرانہ ہی اس کے ہونٹ کچھ کہنے پر مائل ہوئے لیکن پھر آخر کار وہ ان پر تبسم لے آئی......

"مجھے عالی جاہ کہتے ہیں۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر پیشانی تک لے جا کر کہا۔کتنی ہی بار سوتے جاگتے یہ دہرا چکا تھا۔

نام سن کر گلاب پاش کو اس نے اس کے شانوں کے کنارے سے پرے لہرایا اور پھر گلاب پاش کو دونوں ہتھیلیوں میں سمو کر ہاتھ جوڑ لیے ذرا سا پیچھے ہوئی، ذرا سا جھکی اور کہا۔

"پرنام مجھے مانیکا کہتے ہیں......ماں بھی کہا جاتا ہے......پرنام کہتی ہوں...... چرن چھوانے کی ادھکتا تو نہیں ہوگی۔"

آنکھوں کی کمانوں کو اس نے ایسے اٹھایا مانو جیسے اس کی حالت کا نظارہ کرنے کو اس کا دل مچلا جاتا رہا ہو اور وہ بھی اس کی مشق کرتی رہی ہو کہ جو درزیں ڈھونڈ ڈھانڈ تانکا جھانکی کرتا ہے وہ جب پرنام کو جواب پائے گا تو کیسے مچل کر تڑپ جائے گا۔اور ایسا ہوا بھی لیکن پھر وہ اس کے چونک کر اوندھا ہو جانے پر آن کے آن دل شکستہ سی ہوگئی۔

"مانیکا" عالی جاہ نے ایسے صدمے سے کراہ کر کہا جیسے اس کی روح کے باغات کو لوبان کی دھونی دی جانے لگی ہو اور اس اطلاع نے اسے رقص بسمل کی سزا سنائی ہو۔

مانیکا نے زمین سے چھوتی اپنی چولی، چنر کو اٹھانے کی زحمت کیے بنا ان سے الجھتے ہی بھاگ۔جانا

چاہ اور وہ یہ کر گئی۔ لیکن صدمے کا اثر کچھ ساتھ لے گئی کچھ چھوڑ گئی۔

سلام اور پرنام میں ربط گلاب پاش کی موجودگی میں بھی پنپ نہ سکا۔

رات تئے مہمانوں نے جم کر ڈھولک بجائی اور پھر بھی رات سونی رہی۔ نہ ملن کے گیت جاگے نہ ارمان آہ بنے۔

رات میں بن باس پنپنے لگا۔

وہ پھر نیچے آیا۔

"تیل تیلی رکھوا دی ہے تمھارے کمرے میں"

بوا شاید ہنسیں تھیں، کانوں کے بالے جھومنے لگے۔

"سر میں درد ہے کچھ کیجیے......"

اب سر کو کیا ہوا؟ اور کیا کروں میں۔ جاؤ اپنی اماں سے کہو وہ وہاں محفل جمی ہے ان کی۔ اور سنو بابو پہلے سلام کر لینا سب بڑوں کو یہاں سب کو تم سے شکایت ہے کہ تم ٹھیک سے آپ جناب نہیں کرتے۔

"کہیں تو پیر بھی چھوآؤں؟"

اس نے سر اٹھا کر دیکھا اماں پتا نہیں کس کس کے ساتھ لمبی باتوں کے سفر پر نکلی تھیں۔ وہ ایک نظر ادھر دیکھ کر اوپر آ گیا۔

"چرن چھوانے کی ادھکنا تو نہیں ہو گی۔" رات بھر یہی منتر اسے بہلاتا رہا اور دالانوں، بالکنیوں کے کونے بدلتے دن میں وہ اس منتر کو آنکھوں سے پھونکتا رہا۔ نیچے وہ خود کو چھپاتی رہی، نہ مسکرائی اٹھلائی، نہ چٹز میں نہ چولی میں، نہ جھلملا کر نہ اترا کا۔

"دن میں آس پنپنے لگی۔"

شام کو لالٹین اٹھانے اور نئی رکھنے آئی۔ مرد سب احاطے میں تھے قوالی شروع ہونے والی تھی۔ طیب کو اس نے چوکیداری پر لگایا تھا۔ اور وہ مرا جا رہا تھا سیٹی مارنے کے لیے اس سے کہ پہلے انھیں ہی گردن سے پکڑ کر مار دیا جائے۔ وہ چھت پر آ گیا جہاں سے بالائی منزل یہ سامنے ہی دکھائی پڑتی تھی۔

ململ کے کپڑے سے اس نے کھڑے کھڑے چند لالٹینوں کے شیشے اندر سے صاف کیے اور ان میں تیل ڈالتے انھیں روشن کرتی رہی۔

شام گہری ہونے کو تھی اور روشنیوں کا سامان کر دیا گیا تھا۔

آٹھ دس لڑکیاں اتنے سے کام کے لیے جانے کیوں دیری کر رہی تھیں۔ ہنسی ٹھٹھولے کے لیے کیا یہی جگہ اور وقت ملا تھا۔ اب بوا کہاں ہیں خبر کیوں نہیں لیتیں کہ لڑکیاں رنگین جھلمل اوڑھنیاں اوڑھے، نینوں میں کاجل بیٹھائے مردانے میں صرف تیل بدلتے وقت کا اتنا زیاں کر رہی ہیں۔

بہت دیر گزری بوا جاگ ہی گئیں اور ان کی للکار پر کچھ جھٹ پٹ نیچے بھاگ گئیں۔ کچھ نے کانوں میں تیل ڈال لیا اور للکار کو نظر انداز کر دیا۔ اتنا ہی کافی تھا وہ مردانہ چال کی آواز پیدا کرتا نیچے اترا تو جو بچی تھیں وہ بھی کھسک گئیں۔ وہ لالٹین کی لاٹ کو بلاوجہ ٹھیک کرنے لگی۔ تو اب وہ آہٹ پہچان گئی تھی۔ اس کا انداز دلربانہ تھا اور محبوبانہ بھی۔ لیکن ایسا نہیں کہ کچھ طے پا جائے یا وہ کچھ طے کر بھی لے گی۔ اسے یاد تھا کہ سندور دیکھا کہ عین نیچے بندیا چمک رہی ہے۔

"روشنی ہو گی یا نہیں...... کیسا دل کو آ لینے والا اندھیرہ چھایا ہے۔ میں ایسے اندھیرے میں کیسے جیوں بھلا اب۔" عالی جاہ نے بات کی...... ساری بات کہہ دی......

سوال کے جواب کے لیے وہ ذرا ٹھہری اور رخ موڑے بنا وہ سلائی روشن کی اور پھر پھونک مار کر بجھا دی...... اور اس نے تو داستان ہی کہہ دی۔

جس چاہ اور طمطراق سے وہ نیچے آیا تھا اور کئی گھنٹوں سے اوپر ٹہل رہا تھا وہ سب پہلی رات کی سہاگن کی بیوگی کے جوگ میں لپٹ گئے۔ طیب نے سیٹی ماری...... نہ بھی مارتا تو اسے جانا ہی تھا...... لیکن وہ رک گیا اس سے کہن نہیں ہو رہا تھا۔

پھر اندھیرہ ہی؟...... مان؟ اس کی پشت کو دیکھتے جس پر اس کے بال جوگی کی من سادھنا چاپ کرنے کو تھے دیکھتے ہوئے کچھ کہا کچھ بتایا......

اور ایسے ہوا کہ رخ کو اس نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا اور جو بندیا دو نینوں کے بیچ چوکیدار بنی گڑی تھی وہ کسی کام کی نہ رہی سارا مان سمان، جاہ و جلال کی نظر ہو گیا...... کچھ وقت نہ لگا اور دوسری سلائی روشن ہوئی اور تازہ تازہ صاف کی لالٹین روشن ہو گئی۔

طیب سیٹیاں مار مار کر ہلکان ہو گیا اور ایک نہ دو کتنے ہی مہمان مردانے کی طرف آئے۔ وہ اس کا ہاتھ کھینچ کر سیڑھیاں چڑھ کر اوپر لے گیا اور دور سے آتی قوالی کی آواز نے نہ معلوم کیسا سماں باندھا کہ اس کے ہاتھ کی روشن لالٹین کی گواہی میں دو دلوں نے یکساں حال کھیلا......

اور "دو" کا ہندسہ تہمت زدہ ہے۔

☆ ☆ ☆

وہ دو گڈیاں رکھ کر لایا تھا جیب میں۔ وہ یہ طیب کو دے دے گا۔ مہینہ پہلے دور کے کوئی رشتے دار اسے ڈھونڈتے ڈھانتے اپنا کوئی کام نکلوانے اس کے پاس آئے تو باتوں باتوں میں طیب کا ذکر نکل آیا۔

"ایک ٹانگ سے اپاہج ہو گیا تھا ہجرت میں۔ پہلے تو کئی کئی دن کا فاقہ رہتا تھا اب بیوی اور بچیوں نے کچھ سلائی بنائی کا کام شروع کیا ہے تو روٹی میسر ہے۔ دیوانی بہن اور تین بچیوں کے ساتھ غربت جھیل رہا ہے۔"

صغری دیوانی ہو گئی۔ اسے ننھی صغری یاد آئی اور پھر وہ سارے کام چھوڑ کر طیب کی طرف آنے کے لیے آمادہ ہو گیا۔ ایک طیب ہی تھا جسے اس نے تھوڑا بہت تلاشنے کی کوشش کی تھی۔

گلیاں جتنی تنگ ہوتی جا رہی تھیں اتنی ہی مدفن اور تعفن زدہ ثابت ہوتی جا رہی تھیں۔ دور سے بینڈ باجے کی آواز آ رہی تھی جو قریب آتی گئی۔ گلی تنگ ہو گئی اور جب تک بارات آگے نہیں نکل گئی وہ پھنس کر کھڑا رہا۔ شادی والے گھر کے آگے سے گزرا تو ایک نظر گھر کے اندر بھی ڈال لی۔

شادی کے گھر میں دن ایسے پھسلے جیسے آسمان سے مینہ پھسلتا ہے، دھن دھنا دھن۔ شراروں میں لپٹی لڑکیاں گیت مالا بن گئیں۔ منکے پر منکہ گرا اور زندگی کی بیچ پر ایک مالا پرو گیا...... مان اور عالی کی یک جوڑ مالا۔

وہ دہلی سے تھی اور وہ بھی سارے راستے ماپ آیا تھا۔ کتنے ہی ملنے والے، دور کے نزدیک کے، سگے، سوتیلے وہاں رہتے تھے۔ ہاں بس اسے ذرا ڈھیٹ ہونا پڑا کہ جب یہ نوبت آجاتی کہ بس ہاتھ پکڑ کر نکالنے کی نوبت رہ جاتی تو وہ واپس حیدر آباد آجاتا۔ اماں سے دو جوتے کھاتا اور سو جھوٹ سچ بولتا کہ کہاں تھا اور کیا کرتا رہا۔

دو سگائیاں اس نے تڑوا دی تھیں۔ ایک موذی بیماری کا ڈھونگ رچا کر اور ایک بے شرم بن کر لڑکے سے خود کہہ کر۔ گھر والوں کو بھنک نہیں تھی کہ وجہ کیا ہے۔ ورنہ روز مندر جاتی کی اگر وہ ذرا رکھوالی کرتے تو جان جاتے کہ مندر کے نام پر کون سی پوجا ہو رہی ہے۔ مندر کے بہانے زیادہ ہو جاتے تو وہ عالی کی دور کی خالہ زاد جو اس کی سہیلی بھی تھی کی طرف آجاتی اور اس کا برقع لے کر نکل جاتی۔ عذرا کو اس نے خبر نہیں ہونے دی تھی۔ ویسے وہ اس کی سانس بھانس کے سنگ سنگ تھی لیکن عالی جاہ کے مقام سے وہ پردہ نہیں اٹھا سکی۔ اسے پہلی بار یہ دھڑکا لگا کہ یہاں عذرا کی محبت مات کھا جائے گی۔ وہم حقیقت میں نہ بدل جائے اس نے آزمائش سے دور ہی رکھا۔ اور پھر عالیجاہ بھی یہی چاہتا تھا۔

دونوں پرانے قلعوں میں بیگم اور صاحب بن کر گھومتے رہتے۔ بازاروں سے گھر دار بن کر خریداری کرتے۔ باغوں سے اپنے باغیچوں کے لیے پھول توڑتے۔ وہ چولیوں اور ساڑھیوں میں اس کی پسند کے رنگ لیتی اور مانگ نکال کر اس کے نام کا ان دیکھا سندور بھرتی اور اس کے نام پر برت رکھنے لگی۔ سب یوں ہی ہونے دیا گیا۔

سب گھر ایک جیسے تھے۔ وہ تین بار غلط جگہ دستک دے چکا تھا۔ اسے اشتعال آیا کہ وہ آخر یہاں آیا ہی کیوں ہے۔ کیا کرے گا اب وہ طیب سے مل کر۔ کیا ضرورت تھی اتنا جذباتی ہونے کی۔ اس نے چاہا کہ وہ واپس پلٹ جائے لیکن پھر بھی وہ آگے بڑھتا رہا کہ اس مجمعے سے بمشکل جگہ بنا کر گزرا جو آپس میں گتھم گتھا ہو رہے تھے اور اچھا خاصا فساد برپا کر رکھا تھا۔

فسادات کی خبریں جو دور دور تھیں وہ نزدیک تر آتی گئیں۔ جو کل تک اس شہر اور اس گلی تک کی بات تھی اب وہ ساتھ والی گلی اور ساتھ والے گھروں تک آ گئی۔ مرنے والوں کی خبریں دال سبزی کے بھاؤ کی طرح عام ہو گئیں۔

جو خط ٹوٹی پھوٹی اردو میں لکھے جاتے وہ اس تک پہنچ ہی نہ پائے۔ لیکن چند ایک خط جو اس نے طیب کے ذریعے عالی تک پہنچائے جو عذرا کے یہاں اپنا خاندان لے کر آ چکے تھے وہ تو اسے ضرور ملے ہوں گے۔ وہ آس اور امید سے زیادہ پر ہاتھ جوڑے بیٹھی تھی۔ گھر والوں کو اس نے الوداعی نظروں سے دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ ماتا کو وہ بار بار چومتی تھی اور گاہے بگاہے ہاتھ جوڑ جوڑ شما مانگا کرتی۔

عالی اپنا خاندان سرحد پار کروا آیا تھا اور دوسری بار پھر اس پار آ گیا تھا۔ وہ بنا کسی کو بتائے آیا تھا ورنہ اماں کبھی نہ آنے دیتی۔ پاکستان کیمپ میں چند دنوں کے قیام سے وہ تاڑ گیا تھا کہ نئے نئے بنے اس ملک میں اب پیسے والے ہی انسان کہلائیں گے۔ خود کو انسانوں میں شمار کروانے وہ اس پوٹلی کو لینے واپس آیا جو وہ آبائی گھر کی زمین میں دبا آئے تھے۔

واپسی میں کیمپ میں بوسیدہ کپڑوں میں وہ نظر آئی تو وہ ہولے ہولے اس کی شکل کو اکٹھا کر سکا۔

"عالی" وہ اس کا نام یاد کرنے کی کوشش میں نہیں بھی تھا تو بھی وہ اس سے لپٹ گئی اور اسے سب یاد کروا دیا۔

"مان...... تم یہاں......" اسے اتنا سا جملہ بولنے میں کافی وقت ہوئی۔ اس کے حواس یہ ماننے کو تیار ہی نہیں تھے کہ اس کے سامنے وہی ہے۔

"ہاں...... میں تمہارے گھر بھی گئی تھی وہاں اور لوگ آ گئے ہیں...... مجھے پتا تھا تم ضرور آؤ گے۔"

"تم گھر سے بھاگ آئی ہو؟"

نہیں بھاگی تو نہیں ......سدھار آئی ہوں......کتنی منت کی تمہاری کہ مت جانا...... جانا تو مجھے لے کر جانا......عذرا کا پیغام ملا کہ تم پاکستان پہنچ چکے ہو۔ میں جانتی تھی تم مجھے لینے ضرور آؤ گے۔

مجھے تمہارا کوئی خط نہیں ملا......

کیسے ملتا......لیکن تم آئے بھی نہیں لینے......میں یہاں آگئی......تم نہ آتے تو پاکستان آجاتی......

تم پاکستان جارہی ہو؟ ماں تمہاری جاتی نے چچا قدوس کو زندہ جلا......

ہے رام......میں دیکھ رہی ہوں سب......

اب سب الگ ہوگیا ہے ماں......

اسی لیے تو آئی ہوں کہ ہم الگ نہ ہوں......

ہمارا دین دھرم تو الگ ہے......

دھرم......دھرم کی بات پہلے تو نہیں کی......

میں سب یہاں چھوڑے جارہا ہوں......کچھ نہیں لے کر جانا مجھے یہاں سے......

تم بھی تو یہاں کے ہی ہو......پھر خود کو کیوں لے جارہے ہو......

تمہاری وہاں کوئی جگہ نہیں ہوگی ماں......میں تمہیں تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا......

میں کسی زمین پر رہنے نہیں جا رہی......تمہارے ہوتے ایسا کیسے کروں گی......

تم یہاں آئی ہی کیوں؟ کچھ نہیں سوچا کیا؟

سوچا! تمہیں سوچا......تم مجھے چھوڑنا چاہتے ہو......

میں تمہیں تکلیف سے بچانا چاہتا ہوں......

تمہارے ساتھ میں کس تکلیف میں ہوسکتی ہوں ؟یاد کرو رقیہ کی شادی میں تم نے کہا تھا ''موت کی حقیقت تم پر میری جدائی سے کھلے گی۔'' میں تم پر یہ حقیقت نہیں کھول سکتی عالی۔

وہ خاموش رہا......

''کہو تو میں لوٹ جاؤں......'' یہ کہتے اس کی آواز میں مردہ پرندے کی چہکار تھی تو بھی وہ ساری کی ساری اس سے لپٹ گئی کہ وہ کہے لوٹ جاؤ تو وہ دم توڑ دے اور اسی میں لوٹ جائے۔

اور ایسے پرآشوب وقت میں، کیمپ کے خون آشام اندھیرے میں، ہجرتی قافلے کے مسافر نے اپنے اندر غیرت کو امڈتے محسوس کیا اور وہ یہ گوارا نہ کر سکا کہ جو گھر سے خود ہی سدھار آئی ہے اسے یہ بتا دے کہ وہ اس کے لیے نجمہ تھی، حلیمہ تھی، اختر تھی، مہر النساء تھی۔ محبت اس کی خصلت تھی بس۔ وہ تو پہلے دن سے ہی جانتا تھا کہ وہ مانیکا ہے۔ پوجا کی تھالی اور سندور کی پرجاتی سے۔ اور خصلتوں کو پرجاتیوں سے کیا فرق پڑتا ہے۔

زخمیوں کے کراہنے کی آواز آرہی تھی۔ مائیں مرگئیں تھیں ان کے شیرخوار دودھ کے لیے تڑپ رہے تھے۔ تیرہ چودہ سال کی دو لڑکیاں سر پر ہاتھ رکھے ہچکیاں لے رہی تھیں۔ ایک کپکپاتا جھکی کمر کا بوڑھا کیمپ میں رینگ رینگ کر چلتے غفور غفور کی صدائیں لگا رہا تھا۔

پھر بھی وہ خود کو نیچا دکھانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ایک عورت کو کیونکر کہہ دیتا کہ اس نے سب سچ بولا تھا جواب جھوٹ ہوگیا ہے۔ جاؤ لوٹ جاؤ۔ ہمارا تمہارا بس یہیں تک کا یارانہ تھا۔ اپنی حقیقی ذات کے اہرام کو کیونکر ایک عورت کے سامنے ملیامیٹ کر دیتا۔

یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے۔'' خاموشی نے عجیب کام کیا اس کی چہکار لوٹ آئی اس سب پر بھی کہ ذرا فاصلے پر ایک جوان دیہاتن بیوہ اپنے بال نوچ نوچ بین کر رہی تھی۔

''دیکھو میرے کپڑے کیسے تار تار ہوگئے ہیں ۔شرم آتی ہے اب تو۔ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے۔''

''اماں کے زیور۔''

''اماں جی کے زیور۔ ایسا ویسا اتنا کچھ دیکھ لیا ہے۔ لاؤ کچھ اچھا بھی دیکھ لیں۔''

وہ تھیلے میں سے پوٹلی کھول کر دیکھنے لگی۔ شاہدہ، رخسانہ کے لیے زیور الگ کردیئے۔ چھوٹے آزاد اور بڑے اقبال کی دلہنوں کے لیے بھی

''اور یہ میرے ہوئے۔'' عالی جاہ کی دلہن کے لیے بھی۔ پھر یوں مسکرانے لگی جیسے اس کی ساس نے اسے شگن چڑھایا ہو۔

''دیکھو عالی برا نہ مانو تو ان میں کوئی ایک زیور مجھے پہنا دو۔ میرا دل لرزتا ہے یوں یہ اچھا شگون ہو جائے گا۔ ماتا جی کہتی ہیں شگن لیکھ کو چڑھاوا ہے مانو پھر تو لیکھ بھی نہیں بدلتے۔ لچا کرتے ہیں۔''

اس نے ناک کی بالی کو کان کے سوراخ میں پرو دیا اور وہ ایسے خوش ہوگئی جیسے اس کی مانگ میں سندور بھر دیا گیا۔

''میری آتما کو اب قرار ہے عالی۔ میں کیسے کیسے نہیں ڈرتی تھی لیکن اب قرار ہے۔''

اس قرار کو لیے وہ گہری نیند سوگئی تو وہ پوٹلی کو اس کے پہلو سے نکال کر چلا آیا۔ کہ جاؤ بس لوٹ جاؤ۔

بوسیدہ دروازے پر جھولتی زنگ آلود زنجیر کو اس نے اخلاقاً بجایا ورنہ دروازہ وا تھا اور کتا پھٹا پردہ چوکھٹ کو بھی کان لپیٹ کر پلٹ جانے کا سندیسہ دے رہا تھا۔

''آجایئے'' مردانہ آواز جو اس نے پہچان لی

طیب کی تھی وہ اندر چلا گیا۔اس کی آنکھیں قبل از وقت نم ہوگئیں اور سینہ طیب کو بھینچ لینے کے لیے بے تاب ہو گیا۔

اندر جاتے ہی روشنی اور کم ہوگئی اور یکدم اُسے دیوار کا سہارا لینا پڑا۔

طیب اتنا سرد ملا جیسے خون اس کی رگوں میں ہمالیہ سے بہہ کر آتا ہو۔اُسے حیرت ہوئی۔پھر خیال آیا کہ نوٹوں کی جو گڈیاں اس کی جیب میں موجود ہیں وہ شاید اسے تھوڑا گرم کر دیں۔جو بھی تھا اسے دھچکا لگا۔اس کی بیوی اور تینوں بچیاں اسے بس ٹکر ٹکر دیکھتی رہیں جیسے وہ کسی جنگل کا وحشی ہو۔اسے کوفت ہوئی لیکن چھپا گیا۔

''تم نے کبھی مجھے ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کی طیب؟'' یہ سوال وہ اس سے پوچھنا چاہتا تھا اور پوچھ لیا۔

''کیوں نہیں، اور تم ملے بھی۔ایک خط بھی لکھا، کبھی کوئی جواب نہیں آیا سو چا پتا ٹھیک نہیں ہوگا۔'' اس نے پتا ٹھیک نہیں ہوگا ایسے کہا جیسے گھر کے پتے کی بات نہ کر رہا ہو۔

''خط!'' وہ چونک گیا۔وہ فلاں ابن فلاں کے خطوط سے اتنا عاجز تھا کہ اپنے سیکریٹری کو کہہ رکھا تھا ایسے ہر خط کو پھاڑ کر پھینک دیا کریں میرا وقت برباد نہ کیا کریں۔

''مجھے تمہارا کوئی خط نہیں ملا۔اگر ملتا تو میں بہت پہلے تم سے ملنے چلا آتا۔''

طیب خاموش رہا اور اس کی بیوی بھی خاموش رہی، اس کی تینوں بیٹیاں بھی۔اتنی خاموشی میں بھی کوئی تو بولتا رہا۔

اسے طیب کے ایسے غیر جذباتی پن نے صدمہ دیا اور جیب سے نوٹوں کی گڈیاں نکالنے کا ارادہ اس نے ترک کر دیا۔اسے معمولی ہی سہی لیکن دُکھ ہوا کہ کیسے طیب جو اُسے آپ کہا کرتا تھا اب تم پر آگیا ہے۔

صغری کے بارے میں معلوم ہوا تھا کہ وہ دیوانی ہوگئی ہے۔تم نے اس کا علاج نہیں کروایا؟ اس نے طنزاً کہا۔وہ اس کی غربت کا مذاق اڑانے پر آگیا تھا۔

صغری! طیب چونکا جیسے اس کا دل مٹھی میں آگیا۔

''میری صغری! اس نے تو میرے ہاتھوں میں دم توڑا تھا۔''

تو پھر بانو ہے؟ اب کی بار وہ پھنکار رہ گیا

''بانو تو کیمپ میں ہی اماں ابا کے دکھ میں چل بسی تھی۔''

کچھ وقت ایسے ہی سرک گیا تو وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا جانے کے لیے اور ابھی وہ دروازے تک پہنچے ہی والا تھا کہ طیب کی نفرین آواز اُس تک آئی۔

تم جا رہے ہو؟

وہ اچنبھے سے اسے پلٹ کر دیکھنے لگا۔

''تو پھر تم یہاں کرنے کیا آئے تھے؟

''تم سے ملنے'' وہ پھنکار کر بولا

''مجھ سے ملنے۔'' طیب اس سے زیادہ پھنکارا۔

اور اس سے نہیں؟ جس ڈیوڑھی میں وہ کھڑا تھا، لنگڑاتے ہوئے طیب نے آگے بڑھ کر اس میں سے نکلتے ایک چھوٹے اندر کو دھنسے ہوئے دروازے کو ہاتھ بڑھا کر کھول دیا۔

اندر اندھیرہ تھا...... بہت اندھیرہ...... کیوں کہ کوئی جلی ہوئی تیلیوں کو ماچس میں سے نکال نکال کر بجھی ہوئی لالٹین کو روشن کر رہا تھا۔جس میں تیل تھا نہ لاٹ......

یہ مجھے پاکستان کے کیمپ میں ملی تھیں۔ریڈیو سے ان کے شوہر عالی جاہ کے نام کے اعلانات ہر پندرہ منٹ بعد ہوتے تھے۔ہندوستان خط لکھے کہ آ کر لے جائیں انہیں لیکن وہ صرف ان کی جلی ہوئی ہڈیاں لینے پر بضد رہے کہ گنگا میں بہا دیں۔اب آئے ہو تو اسے آزاد کر دو یا اس کی ہڈیاں اس کے پرکھوں کو بھجوا دو آگ لگانے کی تو اب ویسے ہی ضرورت نہیں رہی۔''

طیب نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک چھوٹی سی چابی نکالی جو اس زنجیر کی تھی جو اس کے پیر میں پڑے تالے کی تھی۔

اندھیرہ اتنا بڑھ گیا کہ اس نے طیب کو تھام لیا اور چابی کہیں نیچے گر گئی۔

''محبت جو خصلت ہوا کرتی ہے وہ قسمت نہیں ہوتی۔نا اس کی نا اُس کی۔''

وہ آگے بڑھا اور ان ہڈیوں کو دیکھنے لگا جنہیں اب آگ کی ضرورت نہیں رہی تھی۔وہ ویسے ہی جل رہی تھیں۔

جلتی چیتا میں ہاتھ بڑھا کر اس نے شگن کو اس کے کان سے نوچ ڈالا۔لیکھ اب بدل جائیں گے۔چڑھاوا لوٹ لیا۔

وہ بنا پلٹے اتنی تیزی سے اندر کو دھنستے اس گھر سے نکلا جس میں پانچ لوگ اسے نفرین نظروں سے دیکھ رہے تھے کہ رک جاتا تو دھنس جاتا۔

تین دن بعد طیب کا پہلا اور آخری تار ملا۔''مجھے معلوم ہوتا کہ اُس بالی کو اتارنے سے وہ آزاد ہو جائیں گی تو یہ کام کر چکا ہوتا۔''

اور تین دن بعد وہ راکھ میں وہ ہڈیاں چننے لگا جو ہر روز اس کے اندر ٹھہروں ٹھہر پنپ جاتی تھیں۔

افسانہ

انعامی تصویر

دستگیر شہزاد

میرا ایک مصور دوست ایک ایسی نادر اور نایاب تصویر تخلیق کرنا چاہتا تھا جو مونا لیزا کی طرح نیچرل لگے اور اس کو شہرت کے آسمان پر پہنچا دے۔ اس نے سب سے مشورہ کیا۔ تم اس پاکستانی بچے کی تصویر بناؤ جو امریکہ کے حالیہ ڈرون حملوں میں اپنے دونوں ہاتھ گنوا بیٹھا ہے۔ کسی نے اسے مشورہ دیا۔

عبداللہ کے کٹے ہوئے بازو چہرے پر چھائی ہوئی بے بسی اور پلکوں پر رُکے ہوئے آنسوؤں کو ایسے رنگ دینا کہ بے ساختہ ہر آنکھ سے آنسو ڈھلک جائیں اور دل ماہی بے آب کی طرح تڑپ اُٹھے۔ تمہاری یہ تخلیق موجودہ تہذیب کا المناک اظہار ثابت ہوگی اور آنے والی نسلیں دیکھیں گی کہ طاقت کے نشے میں چور قوموں نے انسانیت پر کیسے کیسے ظلم ڈھائے ہیں۔ اس نے یہ باتیں غور سے سنیں۔ لگتا تھا کہ یہ بات اس کے دماغ میں اُتر گئی ہے۔ کیونکہ وہ دوسرے ہی دن سے اپنے کام میں جت گیا تھا۔ اس نے گھر کے ایک کمرے میں کینوس، برش اور رنگوں کی کائنات اپنے اطراف پھیلا لی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ ضرور بے مثال تصویر بنائے گا لیکن میری اُمیدوں پر پانی پھر گیا۔ اس نے کینوس پر عبداللہ کے کئی خاکے بنائے لیکن وہ فطری رنگ بھر نہ سکا جو کسی تصویر کو نایاب بنانے کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔ حالانکہ وہ انسان کی ظاہری و باطنی کیفیتوں کی عکاسی کرنا جانتا تھا۔ درحقیقت وہ ذہنی کشاکش میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اسی ذہنی تموج کی وجہ سے برش میں وہ مناسب جنبش پیدا نہ ہو سکی جس سے رنگوں کا تال میل برقرار رہتا۔ تھک کر اس نے اپنا ذہن بدل دیا۔ کچھ دن بعد مجھ سے ملا اور کہا سچائی تلخ ہوتی ہے آسانی سے ہضم نہیں ہوتی۔ عبداللہ کی تصویریں دیکھ کر کسی کا دل نہیں پگھلا۔ یہاں تک کہ اس کے اپنے اس کے اطراف رہنے بسنے والوں نے بھی افسوس کا اظہار نہیں کیا۔ اب جبکہ بات پرانی ہوتی جارہی ہے اور دلوں کے گھاؤ بھرتے جا رہے ہیں تو میری بنائی ہوئی تصویر سے لوگ کیا متاثر ہوں گے۔ تعصب کی عینک سے دیکھنے والے فوراً میری اس تصویر کو ناپسند کر دیں گے۔ میں نے اس کو مشورہ دیا کہ رنگ سوچ سمجھے بغیر کینوس پر اُچھال دو۔ دیکھنے والے تجریدیت، اشاریت و علامت اور استعارے خود بخود ڈھونڈ لیں گے۔ ممکن ہے تمہارا تجربہ کامیاب ہو جائے۔ وہ کسی قدر غصے میں بولا، تجریدیت اب دم توڑ چکی ہے۔ استعاروں و اشاروں اور علامتوں پر غور کرنے کے لیے عام انسان کے پاس وقت نہیں رہا ہے۔ میں جھلا کر بولا تو پھر کلنٹن اور لیونسکی کی تصویر بناؤ۔ تم کو اس جنس زدہ تصویر کی تخلیق پر خاصی مقبولیت ملے گی۔

اس نے فوراً جواب دیا کہ تمہاری تجویز بھی نامعقول ہے۔ اچانک اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ آنکھوں میں ایسی چمک لہرائی جیسے کوئی اچھوتے خیال کا الاؤ خود بخود ذہن میں آ چکا ہو۔ ایسی تصویر بناؤں گا جو مجھ کو زندہ جاوید کر دے گی۔ چنانچہ وہ اپنے خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لیے جت گیا۔ ایک ایسی جگہ کا انتخاب کر کے بیٹھ گیا جہاں اس کو مکمل اور بھرپور ذہنی سکون میسر تھا۔ اوپر آسمان تھا جو کبھی نیلا نظر آتا ہے۔ کبھی اودا اور کبھی سفید یا سرمئی۔ جو کہیں برستا ہے اور کہیں نہیں برستا۔ کبھی جو اتنا قہرناک ہو گرجتا ہے کہ دل دہل جائے اور کبھی ایسا شانت ہوتا ہے کہ طبیعت مچل جائے۔ کئی بار سورج نکلا اور ڈوب گیا۔ کئی بار ستارے اُبھرے اور فنا ہو گئے۔ کتنی ہی راتیں آئیں اور چلی گئیں۔ وہ اپنے کام میں غرق رہا۔ اس پر کام کا ایسا جنون سوار تھا کہ اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھا تھا۔ کھانے پینے اور سونے کا بھی خیال نہ رہا۔ بھوک پیاس کی طرف سے غفلت، نیند کی کمی اور سخت موسموں کی زبر دستیوں نے اس پر ایسا اثر ڈالا کہ وہ ایک رات اکڑ گیا اور ایسا اکڑا کہ اس کی اُنگلیوں کے درمیان پھنسا ہوا برش تک نکل نہ سکا اور نہ اُٹھی ہوئی پلکیں بند ہو سکیں۔ ایک فوٹوگرافر کو اس کی اطلاع ملی تو وہ فوراً وہاں پہنچ گیا اور چٹا چٹ اس کی کئی تصویریں لے لیں۔ ایک تصویر اخبار میں چھپ گئی۔ کئی دانشوروں کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ نیچرل تصویر دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ وہ برف کے مجسمے میں تبدیل ہو گیا ہے۔ یہی تصویر اس سال کی بہترین انعامی تصویر قرار دی گئی۔

شاعری

اب کہاں آنکھ ملانے والے
چھپ گئے دل میں سمانے والے
تیرے الفاظ ہیں تیرے اپنے
اور پرائے زمانے والے
نیکیاں آپ سنبھالیں گھر میں
ہم ہیں دریا میں بہانے والے
ہم نے سن لی ہیں تمہاری غزلیں
اب کہو شعر سنانے والے
ہم جو آئے تو بہاریں بولیں
آ گئے پھول چرانے والے
رونق بزم ہے اُن کے دم سے
یاد ہیں ہنستے ہنسانے والے
تو پکارے گا کہاں تک ثاقبؔ
کب رُکے چھوڑ کے جانے والے

آصف ثاقب/بوئی ہزارہ

اک رنگ و نور کا عالم ہے رعنائی ہی رعنائی ہے
پایا ہے اُسے جلوہ فرما جس جانب آنکھ اُٹھائی ہے
وہ ایک ہوا کا جھونکا ہے وہ آوارہ سا بادل ہے
دل پھر بھی اس کا شیدائی دل ناداں ہے سودائی ہے
وہ اذن تکلم تیرا تھا یہ ضبط تکلم میرا ہے
وہ گویائی خاموشی تھی یہ خاموشی گویائی ہے
دل دے کے اس کو دیکھ لیا اب جان بھی ہم دے دیں تو کیا
وہ ہرجائی ہرجائی تھا وہ ہرجائی ہرجائی ہے

تم سے بھی مداوا کیا ہوگا ماحول کی چیرہ دستی کا
اُتنا مربوط ہے سناٹا جتنی محکم تنہائی ہے
وہ دیدہ و دل میں کیا آئے اک وہم سا ہر دم رہتا ہے
جیسے یہ دل بے گانہ ہے جیسے یہ آنکھ پرائی ہے
آداب محبت سے نہ گزر نصرت صدیقی سوچ ذرا
ان اشکوں میں ان آہوں میں رُسوائی ہی رُسوائی ہے

نصرت صدیقی/فیصل آباد

غزل ہے گیت ہے یا کوئی نغمہ میرے اندر
سدا رس گھولتا ہے ایک لہجہ میرے اندر
یہی رنگ معانی ہے یہی حسنِ یقیں ہے
سمٹ آیا ہے اک ذرے میں صحرا میرے اندر
سخن تشنہ ہوں اور دشت محبت میں کھڑا ہوں
رواں ہے آنسوؤں کا گرچہ دریا میرے اندر
کسی کا مسکرانا بھی بڑھاتا ہے مرا درد
نہ جانے کس قدر ہے زخم گہرا میرے اندر
ہر اک غم کو ملے آ کر یہاں تسکین گویا
زمانے بھر کے دکھ ایسے ہیں یکجا میرے اندر
محبت سارے انسانوں سے خوشیاں سب کی خاطر
یہ جذبہ کس نے رکھ چھوڑا ہے تنہا میرے اندر
وہ ملتا ہے تو مجھ کو اجنبی لگتا ہے فرخؔ
نہ جانے مختلف کیوں ہے وہ چہرا میرے اندر

فرخ راجا/اسلام آباد

خاک سے دور آسماں سے دور
دور ہے وہ مرے گماں سے دور
منزلیں گرد ہوتی جاتی ہیں
میں بھٹکتا ہوں کارواں سے دور
یہ جو سائے میں آ گیا ہوں میں
کوئی دیوار ہے مکاں سے دور؟
اپنے ہونے کے خواب میں گم ہیں
بستیاں شہر رفتگاں سے دور
کوئی صورت بلا رہی ہے مجھے
منزل عشق کے نشاں سے دور
جل اُٹھا پھر چراغ گریائی
لفظ ہونے لگے زباں سے دور
قیس و فرہاد پر نہیں موقوف
میں بھی ہوں اس کے آستاں سے دور
قافلے رزق خاک ہونے لگے
داستاں گو ہے داستاں سے دور
راحت وصل کی تمنا میں
خاک اُڑاتا ہوں خاک داں سے دور
کیا یہ یکتائی کی علامت ہے
اک ستارہ ہے کہکشاں سے دور
اوّلیں لمس کی صباحت کو
کوئی کرتا ہے درمیاں سے دور
وہ جو میرے قریب تھا ساجدؔ
ہو گیا اس طرح کہاں سے دور؟

غلام حسین ساجد/لاہور

شاعری

آگہی ترکِ سکونت سے ملی ہے مجھ کو
شہرتِ دائمی ہجرت سے ملی ہے مجھ کو
خواہشِ وصل بھی اب ہجر طلب لگتی ہے
اتنی تسکین اذیت سے ملی ہے مجھ کو
گمشدہ عہد جوانی کی پرانی تصویر
آئینہ خانۂ حیرت سے ملی ہے مجھ کو
میں وہ پارس ہوں جو پیتل کو بنا دے سونا
یہ کرامت بھی ارادت سے ملی ہے مجھ کو
گر مرے پاس زر و مال نہیں تو کیا ہے
دولتِ فکر تو کثرت سے ملی ہے مجھ کو
دیکھ لیتا ہوں پسِ پردہ ہزاروں منظر
یہ بصارت بھی بصیرت سے ملی ہے مجھ کو
وضعداری کو بھلا چھوڑ سکوں گا کیسے
یہ مروّت تو وراثت میں ملی ہے مجھ کو
شعر کہنا نہیں آسان اگرچہ خورشیدؔ
یہ سہولت بھی سہولت سے ملی ہے مجھ کو

خورشید بیگ/میلسی

روزِ ازل سے آپ کے نخچیر ہم اسیر
پہنے ہوئے ہیں آپ کی زنجیر ہم اسیر
کیا جانئے کہ ختم ہو کب غم کا مرحلہ
رہتے ہیں بن کے درد کی تصویر ہم اسیر
مقتل میں پابہ جولاں ہمیں لے کے آئے ہیں
پائیں گے جرمِ عشق کی تعزیر ہم اسیر
زنداں کے روزنوں سے ہوا آئے کہ نہ آئے
تکتے ہیں تیرے حُسن کی تنویر ہم اسیر
ہر بار جرمِ عشق کی پاتے رہے سزا
کرتے ہیں بار بار یہ تقصیر ہم اسیر
کنجِ قفس میں بھی ہے ہمیں تیلیوں کی فکر
رکھتے ہیں دل میں جذبۂ تعمیر ہم اسیر
شعر و سخن میں تو ہی ہمارا امام ہے
چلتے ہیں راستے پہ ترے "میر" ہم اسیر
ہجرت کا حکم کس نے پرندوں کو دے دیا
تکتے ہیں اُجڑے پیڑ اب دلگیر ہم اسیر
شکوہ بھی اب کریں تو کریں کس سے ہم جلیلؔ
لکھوا کے لائے ایسی ہی تقدیر ہم اسیر

احمد جلیل/اوکاڑا

عشق ہے یارو جہاں میں روشنی کا اک چراغ
جس طرح خاکی بدن میں زندگی کا اک چراغ
تختۂ گل کی طرح پھر کھل اُٹھی ہے زندگی
کس کو دیکھا؟ جل اُٹھا پھر عاشقی کا اک چراغ
شب زدوں کو صبحِ منزل کس طرح ملتی نصیب
رہ نما کے ہاتھ میں تھا تیرگی کا اک چراغ
مسجدوں پر "ابرہا" کی طرح کی لشکر کشی
گھر کے اک کونے میں روشن بندگی کا اک چراغ
میر کا وہ معتقد غالب ملے تو میں کہوں
کر دیا ہے تو نے روشن شاعری کا اک چراغ
دو رویوں پر ہے مبنی شاعری میری سحابؔ
اک بغاوت کا الاؤ، پیروی کا اک چراغ

اسلم سحاب ہاشمی/ساہیوال

آج کے دور کا انسان خدا ہے شاید
ہاں یہی جرمِ ضعیفی کی سزا ہے شاید
یا تو پھر اپنی دعاؤں کا طریقہ ہے غلط
یا کہ پھر ہم سے خدا روٹھ گیا ہے شاید
کس کی بس ایک جھلک سے ہوا صحرا گلشن
دھیان اس شوخ کا مجھ دل کو صبا ہے شاید
دل کی بستی میں ہوا غم کی چلی ہے کیسی
دل میں اک درد کا دروازہ کھلا ہے شاید
ہم وفا بانٹتے پھرتے ہیں زمانے بھر میں
اور دنیا ہے کہ ہم سے ہی خفا ہے شاید
کوئی ناپاک قدم مجھ پہ نہ پڑنے دینا
یہ مرے دیس کی مٹی کی صدا ہے شاید
راستے خود ہی بدل جائیں گے منزل میں سحابؔ
کاسۂ دست میں اک ایسی دعا ہے شاید

اسلم سحاب ہاشمی/ساہیوال

نمو پذیر کبھی خاک داں نہیں ہوتا
زمیں کے سر پہ اگر آسماں نہیں ہوتا
تری نگاہ کے سائے کی بادشاہی میں
ترا غلام کہیں بے اماں نہیں ہوتا

شاعری

یہ دوڑ دھوپ فقط عمرِ بے وفا تک ہے
یہ کام کاج سنا ہے وہاں نہیں ہوتا
یہاں زمانۂ فردا پہ بات ہو کیسے
یہاں جو بیت رہا ہے عیاں نہیں ہوتا
مرے کلام میں ابہام مل بھی سکتا ہے
مرا خیال مگر ناتواں نہیں ہوتا
وہ اس طرح بھی مجھے سرفراز کرتا ہے
کہ جس کا مجھ کو ذرا سا گماں نہیں ہوتا
جہانِ رنگ کی ہر شے جھلس گئی ہوتی
ترے کرم کا اگر سائباں نہیں ہوتا
بڑے عذاب میں کٹتا تھی زندگی آکاش
کہیں وہ مجھ پہ اگر مہرباں نہیں ہوتا

احمد سبحانی آکاش/لاہور

کس کی یادوں میں یہ آرام سے جل جاتے ہیں
دن کے ڈھلتے ہی دیے شام سے جل جاتے ہیں
تیرے بخشے ہوئے سب پھول شراروں جیسے
کتنے دامن ترے اکرام سے جل جاتے ہیں
شہر میں جن کا بڑا نام مرے نام سے ہے
آج وہ لوگ مرے نام سے جل جاتے ہیں
وہ جو کملا نہ سکیں غم کے دہکتے دن سے
غم گساری کی خنک شام سے جل جاتے ہیں
آتش ہجر میں ممکن تو نہیں ہے لیکن
تم جو کہتے ہو تو آرام سے جل جاتے ہیں

جب کوئی تجھ سے تعلق ہی نہیں ہے مجھ کو
کیوں دیے دل میں ترے نام سے جل جاتے ہیں
جن کو نفرت کے سوا اور کوئی کام نہیں
وہ محبت بھرے پیغام سے جل جاتے ہیں
سات پردوں میں سلگتی ہے کہیں شمع کوئی
کچھ پتنگے کہیں گم نام سے جل جاتے ہیں
مجھ کو اس خواب کی تعبیر بتائے کوئی
پیرہن حدتِ اجسام سے جل جاتے ہیں
تلخی تلخی کو مٹاتی ہے ذرا پی تو سہی
دکھ بھی بادۂ گل فام سے جل جاتے ہیں
ہم جو فرقت میں سلگتے ہیں تو حیرت کیا ہے
سنگ بھی ہجر کے آلام سے جل جاتے ہیں
کاش گلشن میں کوئی آئے مسیحا ان کا
اب تو کانٹے بھی گل اندام سے جل جاتے ہیں
تتلیاں خوشبوؤں کا پیغام سناتی ہیں نبیلؔ
پھول جب گرمیِ آلام سے جل جاتے ہیں

ڈاکٹر نبیل احمد نبیل/لاہور

یہ شہرِ ہوش رُبا ہے تو احتیاط سے چل
ہر ایک شخص خدا ہے تو احتیاط سے چل
دراڑ ڈال نہ دے سانس کی روانی میں
خرابِ آب و ہوا ہے تو احتیاط سے چل
نوادرات میں دل کا شمار ہوتا ہے
کیوں اس پہ پاؤں دھرا ہے تو احتیاط سے چل

غرور خاک میں ملتا ہے تاجداروں کا
یہ زیست موجِ فنا ہے تو احتیاط سے چل
دلوں میں کفر کے فتوے چھپا کے بیٹھے ہیں
لبوں پہ نامِ خدا ہے تو احتیاط سے چل
کسی نے کل کے لیے کچھ نہیں ذخیرہ کیا
یہاں پہ قحط پڑا ہے تو احتیاط سے چل
میں اپنی آگ میں جل کر ہی آفتاب ہوا
یہ میری طرزِ ادا ہے تو احتیاط سے چل

آفتاب خان/لاہور

ہے چھوڑ کے جانا تو مجھے چھوڑ مکمل
دے ساتھ کسی کا مرا دل توڑ مکمل
ہے ساتھ نبھانا تو مرا ساتھ دے ایسے
دل اپنا مرے قلب سے دے جوڑ مکمل
افسانے کے کردار تو سب ہی ہیں پرانے
دے اپنی کہانی کو نیا موڑ مکمل
کافی نہیں چلنا ہی فقط جانبِ منزل
کچھ پانا اگر ہے تو یہاں دوڑ مکمل
آؤ کبھی ہم مل کے کریں امن کی خاطر
اِک آخری کوشش جو ہو سر توڑ مکمل
اُس طرزِ تخاطب نے ترے آخری خط میں
تا روح دیا ہے مجھے جھنجھوڑ مکمل
آ پھر سے کریں ملنے کی ایسی کوئی کاوش
جو ٹوٹتے بندھن کو بھی دے جوڑ مکمل

اس بار نہ آئے گا مقّی دام میں تیرے
تو خود کو جلا ڈال کہ سر پھوڑ مکمل

عتیق الرحمٰن صفی/گجرات

بکھر خاک کب مکمل ہے
ویسے دیکھو تو سب مکمل ہے
راکھ اپنی اُٹھا کے لے آیا
میں نے دیکھا کہ شب مکمل ہے
وہ مرے ساتھ چل نہیں سکتا
جس کی اپنی طلب مکمل ہے
جو سمجھ آ سکے ادھورا ہے
جو بھی شے ہے عجب مکمل ہے
میں نے سائے کو مار ڈالا ہے
میری تنہائی اب مکمل ہے

شجاع شاذ/سیالکوٹ

میں نے تیرے ہجر میں ایسے اتنے سال گزارے ہیں
اب تو میں بتلا سکتا ہوں دن میں کتنے تارے ہیں
آج بھی ایک عمل سے دلوں کو موم کیا جا سکتا ہے
اس کے گھڑے میں پانی بھر دو جس نے پتھر مارے ہیں
آخر اس مغرور نے بھی اقرار میں سر کو جنبش دی
بالکل یوں سمجھو ہم نے کیکر سے بیر اُتارے ہیں
مجھ سے کوئی کام نہیں ہوتا تھا اتنی عجلت میں
اس نے فقط "میں ہوں ناں" کہہ کر سارے کام سنوارے ہیں
ورنہ تم جیسوں سے کبھی شطرنج نہیں کھیلی ہم نے
تم کو کھیل کا عادی کرنا تھا سو کھیل کے ہارے ہیں

مشتاق احمد/لاہور

مری دلیز پہ سورج کھڑا ہے
پسینہ چاند کو آنے لگا ہے
اندھیرو روزنِ در سے نہ گزرو
ابھی اک طاق میں جلتا دیا ہے
کئی چہرے دکھاتا ہے مجھے وہ
اگرچہ آئینہ ٹوٹا ہوا ہے
مری آنکھیں اُسے تو دیکھتی ہیں
مگر نظروں میں تو بھی آ گیا ہے
میں جب بھی دیکھتا ہوں اپنے اندر
کوئی چاروں طرف پھیلا ہوا ہے
مرے ٹوٹے مکاں سے کچھ ہی آگے
محل اُس کا بھی آخر گر گیا ہے
کسی جگنو کی دُم کے عین نیچے
اندھیری رات نے بچہ دیا ہے
جو مسجودِ ملائک تھا اُسی نے
بتانِ دہر کو سجدہ کیا ہے
چلے آؤ کہ پھر دشتِ بلا میں
حسینؓ ابن علیؓ خیمہ کشا ہے

ڈاکٹر نادر علی شاہ/لاہور

کسی کی آنکھ جو کھڑکی سے تک رہی ہے ابھی
اُمیدِ وصل یوں دل میں چمک رہی ہے ابھی
بجھا رہی ہے اندھیرے میں راستہ مجھ کو
تمہاری یاد کرن ہے چمک رہی ہے ابھی
ترے جمال کا جادو ابھی ہے جوبن پے
ترے خیال کی چوڑی کھنک رہی ہے ابھی
ٹھٹھرتی رات بھی تکلیف کیا مجھے دے گی
کہ تیرے لمس کی آتش دہک رہی ہے ابھی
ابھی نہ ہوگا ستارا نصیب کا روشن
ہمارے پاؤں سے دھرتی سرک رہی ہے ابھی
دُعا کی شاخ گلابوں سے کس طرح مہکے
کہ فصلِ ہجر مقدر میں پک رہی ہے ابھی
بجھا ہوا ہے مرا دل جہاں وہیں شاہد
کسی کے رُخ پہ مسرت دمک رہی ہے ابھی

ہمایوں پرویز شاہد/لاہور

خوشبو کا عنوان بسا ہے
جانے والا آن بسا ہے
اک کورا سا کاغذ میں ہوں
کہتے ہو دیوان بسا ہے
چپ چپ رہتے ہیں یہ پنچھی
ان میں بھی وجدان بسا ہے
یادیں ہلچل کر دیتی ہیں
جھومر میں یزدان بسا ہے

شاعری (غزل، نظم)

بارش سے ڈر جاتا ہے دل
الفت کا امکان بنا ہے
ہرگز دل نہ توڑو لوگو
مسجد میں رحمان بسا ہے

سعید محمد سعید/لاہور

دوستوں سے جدا تھا
زندگی سے خفا تھا
وقت ایسا بھی آیا
جینا مرنا سزا تھا
دیکھنے میں تھا سادہ
آدمی وہ برا تھا
بے خبر تھا سفر سے
ہم سفر چاہتا تھا
کیا ہوا اب نہیں ہے
وہ کبھی تو مرا تھا
زندگی کو بھی ساگر
الوداع کہہ رہا تھا

صدام ساگر/گوجرانوالہ

ذکر ہر بار کروں گل کا بھی رُخسار کے ساتھ
جب کہ تصویر کروں اُن کو میں اشعار کے ساتھ
اب تو ہر ایک سے کہتے ہو سنبھل کر بولو
میں نہ کہتا تھا کہ کان ہوتے ہیں دیوار کے ساتھ
یہی بنتا تھا صنم میری وفاؤں کا صلہ
آج جو چھوڑ چلے ہو مجھے اغیار کے ساتھ
داستاں تو نے تو لکھی ہی نہیں میری کہیں
کیسا ناتا ہے ترا آج کے اخبار کے ساتھ
اک طرف ذکر ترا ایک طرف قلبِ حزیں
جیسے شاعر کی لگن ہوتی ہے اشعار کے ساتھ
راہ چلتے کو بتایا نہیں دشمن اپنا
دشمنی کی ہے تو کی ہے کسی معیار کے ساتھ
بھری محفل میں عقیل اس نے اُڑایا ہے مذاق
بات اس شخص سے کی تھی میں نے تو پیار کے ساتھ

عقیل/ایلسی

تم نے بات نہ مانی، اے دل!
کون کسی کا ساتھی، اے دل!
غم سے آنکھ تو بھیگ چکی تھی
چیخ تری کیوں نکلی، اے دل!
جھلمل جھلمل تاروں میں ہے
چاند سی صورت کس کی، اے دل!
سچ پہ زباں گر ساتھ نہ دے گی
دے گا کون گواہی، اے دل!
ناؤ بھنور سے نکلی ہی تھی
موج قضا لے ڈوبی، اے دل!
منزل کی خواہش کیا کرتا
تم تو رہتا راہی، اے دل!

مدثر حسن/ملتان

یہ نہ ہو پھر کوئی نقصان اُٹھایا جائے
شہر سویا ہوا لگتا ہے جگایا جائے
مجھ کو مرنا ہے فسانے میں محبت کے لیے
میرا کردار محبت سے نبھایا جائے
کیوں نہ کمرے کی اُداسی کو مٹانے کے لیے
خالی گلدان میں اک پھول سجایا جائے
ضبطِ غم سے کہیں پتھر ہی نہ ہو جاؤں میں
التجا ہے مجھے جی بھر کے رُلایا جائے
اتنا ٹوٹا ہوں کہ جڑنا میرا ممکن ہی نہیں
شمس اس بار مجھے پھر سے بنایا جائے

زاہد محمود شمس/ملتان

صبح کا گیت گا رہی ہوں میں
تیرے نزدیک آ رہی ہوں میں
آخری سانس کی طرح ہو تم
قیمتی ہو بچا رہی ہوں میں
راستہ دے رہی ہوں خوابوں کو
نیند کے پاس جا رہی ہوں میں
پاس تو کوئی بھی نہیں ہے میرے
خواب کس کو سنا رہی ہوں میں
ایک بچے کی تھام کر انگلی
خود کو چلنا سکھا رہی ہوں میں
میرا حصہ ہے بہتے دریا میں
پانیوں کی دعا رہی ہوں میں
میری آنکھیں بہت چمکتی ہیں
جگنوؤں میں بڑا رہی ہوں میں

تیرے جانے سے بھی بہت پہلے
ہجر میں مبتلا رہی ہوں میں

تجدید قیصر/لاہور

ماضی کے سارے قرض چکانا پڑے مجھے
طوفاں میں اب کے پاؤں جمانا پڑے مجھے
عادت نہیں تھی رستہ بدلنے کی اس لیے
وعدے وفا کے سارے نبھانا پڑے مجھے
چُن چُن کے اپنے خواب جلانا پڑے مجھے
آیا تھا کھا کے ٹھوکریں دنیا سے راجؔ وہ
شکوے تھے بے حساب، بھلانا پڑے مجھے

رئیس راج/ملتان

میرے حق میں جو فیصلہ ہوگا
لوحِ تقدیر کا لکھا ہوگا
اس کی جانب رواں دواں ہیں قدم
بابِ رحمت ابھی کھلا ہوگا
اس کے ہاتھوں سے بڑھ کے پی لیں گے
زہر بادہ میں گر ملا ہوگا
اس کی مرضی پہ منحصر ہے ملن
کیا کرے گا یہ دیکھنا ہوگا
عمر ساری چھپے رہے مجھ سے
روزِ محشر تو سامنا ہوگا
اس سے ملنے کے بعد لگتا ہے
چاندنی ہوگی، رتجگا ہوگا

صابر انصاری/ملتان

ہجر

غم کی بارش لمحہ لمحہ
اُتر رہی تھی آنکھوں میں
کھڑکی پہ اک دھندلا سا مٹیالہ سا
چاند کھڑا تھا سہما سہما
دیکھ رہا تھا چہروں کو
اُلجھے بکھرے عکس تھے سارے
تک رہے تھے دیواروں کو
من کے ویراں جنگل کی سب شاخیں
اُٹھتی جھکتی لرزیدہ سی خوفزدہ سی
اور ہوائیں سوگ مناتی پھرتی تھیں
چاروں اور یاس کا کالا بھورا اندھیرا
آس دریچے میں اُتری
کرنوں کو چاٹتا جاتا تھا
میری سانس میں ہجر کا موسم
مجھ کو کاٹتا جاتا تھا

آسناتھ کنول/لاہور

میں کیسے بھولوں وہ خوبصورت سی چاکلیٹی سی شام
بدن تمہارا کہ خوشبوئیں لہلہا رہی تھیں
تمہاری آنکھوں سے عکس کوئی جھلک رہا تھا
وہ جس میں وادی کا سبز منظر چمک رہا تھا
تمہارے ہونٹوں میں قہقہوں کے حسین موتی دمک رہے تھے
وہ شام تو روشنی کے رازوں سے یوں بھری تھی
کہ جیسے منظر مہک رہا ہو
وہ خوبصورت سی رہگذر کی حسین پینٹنگ
خوش آمدید ہم کو کہہ رہی تھی
کہ حیرتی آنکھ دیکھتی تھی
ہمارے ہاتھوں کی سب لکیروں میں
کہکشاؤں سے راستوں کے نشاں بنے تھے
چہار جانب ہی آئنوں میں تھا رقصِ حیرت
وہیں کہیں بے وجود سایہ
جو منظروں میں پہ کہیں سے پردے گرا رہا تھا
کہیں وہ کچھ کچھ دکھا رہا تھا کہیں وہ کچھ چھپا رہا تھا
کہ جستجو کو بڑھا رہا تھا
ہماری آنکھیں بس ایک پل کو جھپک گئی تھیں

عاصمہ طاہر/لاہور

جاتے دن کی چوکھٹ پر
جب شام اُترنے لگتی ہے
اور سائے ڈھلنے لگتے ہیں
دور اُفق پہ پنکھ پھیلائے
ڈار کی صورت منچلے پنچھی
جب واپس مڑنے لگتے ہیں
میں اکثر اُن کو دیکھتی ہوں
گھاس گھروندہ بن کر وہ
مٹی سے رزق کو چن کر وہ
اک دوجے کے آگے پیچھے
پنکھ ہلاتے اُوپر نیچے
باتیں بھی تو کرتے ہوں گے
اُن کے بھی تو دکھ سکھ ہوں گے
اس پکھ پکھیرو جاتی کا
کیسا جیون ہوتا ہوگا
دور اُفق پہ پنکھ پھیلائے
آگے پیچھے ڈولتے پنچھی
اک دوجے سے بولتے پنچھی
دیکھ کے اکثر سوچتی ہوں
جس پنچھی کا گھر نہیں ہوتا
شام کے سائے ڈھلنے پر وہ
کس کی آس پہ لوٹتا ہوگا
کس کی آس پہ لوٹتا ہوگا

طیبہ امبر/لاہور

شام و سحر کے درمیاں

رئیس عباس زیدی

جھنگ جھنگ زندگی

ہم لوگ ۱۹۶۴ء کی بہار میں جھنگ آ گئے۔ ایم بی ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر میاں اقبال صاحب نہایت رُعب اور دبدبہ رکھنے والے منتظم تھے۔ ساڑھے چار فٹ کے ایک منحنی سے بچے کو دفتر کے سامنے کھڑا دیکھ کر بھاری بھرکم آواز میں بولے:

"کون ہو اور کیسے کھڑے ہو؟"

"میں میں داخل ہونے آیا ہوں دسویں جماعت میں"

"ٹیسٹ ہوگا"

ٹیسٹ ہوا اور داخلہ ہو گیا۔

"میں کرکٹ بھی کھیلتا ہوں۔" اُسی کمزور سے بچے نے کہا۔

"اُس کا بھی ٹیسٹ ہوگا۔" شام کو کرکٹ گراؤنڈ میں ہیڈ ماسٹر صاحب خود موجود انچارج کرکٹ اور PTI۔ تین لمبے تڑنگے زمینداروں کے لڑکے فاسٹ باؤلر لگا دیے گئے۔ جب یہ منحنی سا بچہ آدھا گھنٹہ آؤٹ نہ ہوا تو ہیڈ ماسٹر صاحب نے فیصلہ سنایا۔

"تم آج سے ہماری ٹیم کے اوپنر ہو۔" اور تمام عمر بیک فٹ پر کھیلنے کی عادت پڑ گئی۔

پتنگ بازی، کبوتر بازی، گلیوں میں کانچ کی گولیوں اور اخروٹ کھیلنے کی اجازت نہیں تھی لیکن اگر کرکٹ کا میچ کھیلنے جوہر آباد بھی جانا ہوتا تو اماں اجازت کے ساتھ پیسے بھی نکال کر دے دیتی تھی۔

میٹرک کا امتحان ہو چکا تھا نتیجہ کا انتظار تھا۔

۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کو صبح فیلڈ مارشل ایوب خان کی وہ تاریخی خبر ریڈیو سے نشر ہوئی جو کہ الطاف گوہر نے انگریزی میں لکھی اور قدرت اللہ شہاب نے اُردو میں ترجمہ کی تھی۔ تقریر سنتے ہی اماں نے حکم دیا کہ بھن کو بھیرہ سے لے آؤ کہ سرگودھا کے قریب ہونے کی وجہ سے خطرناک ہے۔ ۶ اور ۷ ستمبر کی درمیانی رات سرگودھا پر بہت بھاری تھی۔ شام کے وقت سرگودھا پہنچا۔ خطرے کا سائرن بسوں کے اڈے پر بھی بج گیا۔ لوگ اوندھے اور میں سیدھا لیٹ گیا۔

زندگی میں پہلی بار ڈاگ فائٹ دیکھی کہ اس کا اُردو ترجمہ نہیں ہو سکتا۔ پی اے ایف کے جہازوں پر دو دائرے اور ہندوستان کے جہازوں کے نیچے ترنگا یعنی تین دائرے۔ پاکستانی جہاز غالباً سیبر جیٹ تھے اور ہندوستانی ناٹ یا روسی SU7 تھے۔ بھیرہ جانے کے بجائے سیٹلائٹ ٹاؤن سرگودھا ہی میں بھائی کے گھر شب بسری کا فیصلہ کیا۔ صحن میں W کی شکل کی خندق ایک پڑوسی پائلٹ کی ہدایت کے مطابق کھودی۔ رات بھر کبھی بمباری اور کبھی سٹریفنگ ہوتی رہی۔ جب ہندوستانی جہاز آتے تو اینٹی ایئر کرافٹ گنیں آتش بازی شروع کر دیتیں۔ ایسا لگتا جیسے ہزاروں فانوس فضا میں اُڑتے چلے جا رہے ہیں۔ اُس عمر میں ڈر اور خوف نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ خندق کے باہر سیدھا لیٹ کر یہ تماشہ دیکھتا۔ صبح پتا چلا سرگودھا کے گرد و نواح میں چوبیس ہندوستانی جہاز گرائے گئے ہیں۔ ان میں ایم ایم عالم کے گرائے گئے تین جہاز بھی شامل تھے۔

گورنمنٹ کالج جھنگ اور جھنگ کا ماحول خاصا ادبی تھا۔ کیپٹن جعفر طاہر بڑی لے اور ترنگ سے "ایک سو سپاہی" اور

"ابھی تو آ رہا ہوں لوٹ کر محاذِ جنگ سے پڑھتے"

کیپٹن جعفر طاہر نے اُردو زبان میں پہلی بار Cantos لکھے اور راگ بے جوڑ وتی کو نظم کیا۔ شیر افضل جعفری اپنی کلاہ سمیت بڑی شان سے پڑھتے:

کنگ ویچے ہیں ساگ کھاتے ہیں
مولا سائیں کے راگ گاتے ہیں
جھنگ جھنگ زندگی سنگ سنگ زندگی
راگ راگ زندگی رنگ رنگ زندگی

☆☆☆

فقیہہ شہر کو حیراں قلندروں نے کیا
گلی گلی نکل آئے علی علی کرتے

ایک جگہ اپنے کلام میں بڑی معصوم سی آرزو کی:

"خدا کی ذات کو بہلا کے جھنگ لے آؤں"

بطور اسسٹنٹ کمشنر ٹھری میر واہ خیر پور سندھ شیر افضل جعفری صاحب کا ایک خط ملا:

"وادیٔ مہران کی بے مہر
وادیوں میں چناں بیلے کی
شیشم چھاؤں تلے ساتھ کھیلے
بیلیوں کو بسار دینا"

پیر کوٹ سدھانہ ایک چھوٹا گاؤں دریائے چناب اور دریائے جہلم کے سنگم پر واقع ہے۔ یہاں دونوں دریا صاف ملتے نظر آتے ہیں۔ چناب کا پانی سرخی مائل اور جہلم کا پانی قدرے شفاف ہے۔

اس مردم خیز خطے میں قریہ قریہ ذہین لوگ پھوٹتے ہیں۔ یاسین کمہار پیر کوٹ سدھانہ کا رہنے والا تھا۔ اس کے گیت جھنگ میانوالی اور سرائیکی بیلٹ کے بہت سے لوک فنکار گاتے:

او ککڑا دمی دیا کویلے ڈتی ای اے بانگ
ماہیا ٹور بیٹھی میکوں پچھے لگا ارمان

ترجمہ: اے مرغِ سحر تو نے بے وقت اذاں دے دی میں اپنے محبوب کو رُخصت کر بیٹھی اور اب پچھتا رہی ہوں

زمانہ ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کے ذرا بعد کا ہے۔ ضیاء الحق کے مارشل لاء کا ابتدائی سخت ترین دور ہے۔ قید و بند، کوڑے، ٹکٹکیاں، لاہور اور اٹک کا قلعہ۔ ایسے میں اس نے شعر لکھا:

وچ جی ٹی ایس معشوق ڈٹھا
ماحول تے مارشل لاء باجرنیل ضیاء ہا

ترجمہ: "میں نے گورنمنٹ ٹرانسپورٹ کی بس میں ایک محبوبہ کو دیکھا جو رُعب حسن کی وجہ سے ماحول پر مارشل لاء تھی۔ جرنیل ضیاء تھی۔"

کالج اور کمپنی باغ میں مشاعرے ہوا کرتے جس میں مقامی شعراء اور ملک کے نامور شعراء تشریف لاتے۔ ستمبر کی جنگ کے فوراً بعد ہی کمپنی باغ میں ایک مشاعرہ ہوا۔ عقیل ہوشیار پوری اور عبدالحمید عدم تشریف لائے۔ فرمائش کر کے خمریات سنی گئیں۔

کہتے ہیں عمر رفتہ کبھی لوٹتی نہیں
جا میکدے سے میری جوانی اُٹھا کے لا

آتش آفتاب پیتا ہوں
غیرت ماہتاب پیتا ہوں
دنیا والوں نے مار ڈالا ہے
انتقاماً شراب پیتا ہوں

☆☆☆

میں بھی کتنا عجیب انساں ہوں
زُہد سے اختلاف کرتا ہوں
جب سحر کی اذان ہوتی ہے
میکدے کا طواف کرتا ہوں

اور

کون کہتا ہے مئے نہیں چکھی
کون جھوٹی قسم اُٹھاتا ہے
میکدے سے جو بچ نکلتا ہے
تیری آنکھوں میں ڈوب جاتا ہے

ٹیلی ویژن ابھی لاہور کی حد تک تھا بوسٹر نہیں لگے تھے۔ ٹرانسسٹر ریڈیو عام ہو گئے تھے۔ شام کو کرکٹ اور ٹینس کے علاوہ کتابیں پڑھنا ہی رہ جاتا تھا۔ جس طرح آوارہ گردی بے مقصد گھومنے کو کہتے ہیں اس طرح مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے بے مقصد مطالعہ کے لیے "آوارہ خوانی" کا لفظ استعمال کیا ہے جو سامنے آیا پڑھ ڈالا۔ ایک مصنف شروع کیا اُس کی لکھی ہوئی ہر کتاب پڑھ ڈالی۔ ابن صفی اور شفیق الرحمٰن سے ہوتے ہوئے سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، عصمت چغتائی سے کچھ ساتھی شمع، اخبار جہاں، حور اور زیب النساء تک رہ گئے۔ حقیر فقیر سولہ سترہ سال کی عمر میں غالب، خواجہ غلام فرید، امام غزالی، میکاولی، ایڈولف ہٹلر اور کارل مارکس کی طرف نکل گیا۔

چیئرمین ماؤزے تنگ کی لال کتاب سرہانے رہنے لگی۔ اس ملک کے سیاسی مسائل کا حل معاشی مساوات میں ہے۔ معاشی ناہمواری کیسے کیسے مسائل کو جنم دیتی ہے۔ فیوڈل سوسائٹی اور سرمائے کا چند گھرانوں میں جمع ہو جانے سے جمہوریت بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ جس عمر میں بچے جاسوسی ناول پڑھا کرتے ہیں یہ بچہ سوشلزم اور تصوف کے چکر میں پڑ گیا۔ ہمارے شہر میں نفیس فاروقی صاحب پیپلز پارٹی کے ممبر بنا رہے تھے۔ لہٰذا باقاعدہ ۱۹۶۷ء میں ممبر شپ فارم پر کر کے دستخط کر کے ممبر بنے۔ اگر کسی نے ریکارڈ دیکھا تو شاید فاؤنڈر ممبروں میں سے ہوں۔

ایک دن کالج جاتے ہوئے اُس قد آور شخصیت سے ملاقات ہو گئی جس نے آنے والی زندگی پر گہرے نقوش چھوڑے۔ ذوالفقار علی بھٹو، نواب زادہ افتخار احمد انصاری کے گھر قیام پذیر تھے۔ ہم لوگ کالج جاتے ہوئے اُن سے اتفاقاً جا ٹکرائے۔

"تم نے چیئرمین ماؤزے تنگ کا بیج لگا رکھا ہے۔"

"سر یہ کیمونسٹ ہے" ملک اقبال نے کہا۔

"نہیں چیئرمین ماؤ ایشیا کے عظیم ترین لیڈر ہیں"

دھاری دار گہرے نیلے رنگ کا سوٹ، نیلے رنگ کی دھاری دار قمیض، بالوں سے بھرے سانولے ہاتھوں پر سونے کی خوبصورت گھڑی اور آکسفورڈ شوز۔ جھنگ کالج کے اُس طالب علم نے یہ حلیہ تمام عمر کے لیے اپنا لیا۔ فیشن آئے گئے لیکن آکسفورڈ شوز کا پیچھا نہ چھوٹا نہ ہی نیلی دھاری دار قمیضوں کا۔ اُن سے دوسری ملاقات اُس دن ہوئی جب گنگا طیارہ کشمیری مجاہد لاہور اغواء کر لائے تھے۔ ہم انگلش ڈیپارٹمنٹ پنجاب یونیورسٹی کے طلباء اُس طیارے کو دیکھنے کے لیے گئے تھے۔ جاوید ملک ایک اہم جماعت جو PPI میں جزوقتی کام کرتے تھے، کے ہمراہ VIP لاؤنج میں بھٹو صاحب کے ساتھ جا بیٹھے۔ بھٹو صاحب اپنے مخصوص انداز میں گنگا طیارے کے ہائی جیکرز سے ہاتھ ملا کر وہاں آ بیٹھے تھے۔ یہ ملاقات نصف گھنٹہ جاری رہی جس میں جاوید ملک نے کم اور راقم نے زیادہ باتیں کیں۔ اُن کی شخصیت واقعی سحر انگیز تھی۔

جھنگ ایک قدیم اور تاریخی شہر، سکندر اعظم، مقدونیہ کا شہزادہ جب باپ کی میت کے سرہانے رو رہا تھا تو اُس کی ماں اولیمپیاس نے کہا "تم کیوں روتے ہو۔ یہ تو تمہارا باپ نہیں ہے۔ تم تو دیوتاؤں کے بیٹے ہو۔"

اور یوں یہ عظیم جرنیل سمجھنے لگا کہ وہ ناقابل شکست ہے اور دشمن کے ہتھیار اُس پر اثر نہیں کر سکتے۔ جنگ میں وہ کیولری کا پہلا چارج خود لیڈ کرتا۔ ایران اُس زمانے کی سپر پاور تھا۔ دارائے اعظم کے ساتھ مقابلہ میں بھی اُس نے ایسا ہی کیا۔ پورس کے معرکے سے فارغ ہونے کے بعد سکندر اعظم نے فوج کے تین حصے کیے۔ میمنہ، میسرہ اور قلب۔ رائٹ ونگ اور لفٹ ونگ پیدل اور گھوڑوں پر اور قلب لشکر کو کشتیوں پر دریائے جہلم میں ڈالا۔ جھنگ کے قریب جہلم اور چناب مل جاتے ہیں۔ اس سنگم پر اُسے میمنہ اور میسرہ کو اکٹھا کرنا پڑا۔ قدیم تواریخ میں جھنگ کو دو فوجوں کے ملنے کی جگہ بھی لکھا گیا ہے۔ یہاں فوج نے دیوی "ہیرا" (Hira) کا مندر بنایا۔ سسلی، اٹلی اور یونان میں آج بھی بغیر چھت کے مندر مل جاتے ہیں۔ ہیرا بہت خوبصورت دیوی ہے۔ ان محترمہ کو "افروڈائٹس" بھی کہتے ہیں۔ ٹرائے کے شہزادے پیرس نے سپارٹا کی ملکہ ہیلن سے یہی تو کہا تھا کہ تم دیوی ہو اور ہم تمہاری پوجا کرتے ہیں۔ اُسے بھگا کر ٹرائے لے آیا۔ یہی وہ چہرہ تھا جس کے لیے ایک ہزار جہازوں کا بحری بیڑہ ٹرائے پر چڑھ دوڑا۔ انگریزی زبان کے درجنوں محاورے اور نفسیات کی اصطلاحیں

اس جنگ سے نکلیں۔ ٹروجن ہارس، اپلکو ہیں اور الیکٹرا کمپلکس کہ ٹرائے آتے ہوئے سپہ سالار اگامنان نے سمندر کے دیوتا کے طوفانی غصے کو ٹھنڈا کرنے کے لیے اپنی بیٹی الیکٹرا کی قربانی دے دی۔

ہیرا کا مجسمہ یقیناً سفید سنگ مرمر کا خوبصورت مجسمہ ہوگا۔ سکندر کی فوجوں کا گھوڑ سوار ایرانی دستہ ''اسپ یال'' وہیں بس گیا ہوگا اور فونیٹک ویریئیشن سے سیال بن گیا ہوگا۔ اپنی خوبصورت بچیوں کو لوگ ہیرا یا ہیر کہنے لگے ہوں گے۔ ہیر رانجھا کا چھوٹا موٹا قصہ ہوا ہوگا جیسے ہر جگہ ہوا کرتے ہیں۔ دمودر نے پہلی ہیر لکھی جس کے ہر بند کے بعد وہ کہتا ہے:

''اکھیں ڈٹھا آکھ دمودر''

''دمودر کہہ دو جو تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے''

دوسری ہیر ہاشم شاہ نے لکھی۔ پھر پیر وارث شاہ کے ساتھ بھاگ بھری والا قصہ ہو گیا۔ بلوچوں نے ایک جھوک وسائی اور پھر چلے گئے اور وارث شاہ کو زندگی بھر کا زخم دے گئے۔ وارث شاہ نے ہیر لکھ کر اس رومانوی قصے کو امر کر دیا۔ پیر وارث شاہ کہیں کہیں بھاگ بھری کا ذکر کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔

پیر وارث شاہ کو صوفی شاعر کا درجہ حاصل ہے۔ مسائل تصوف بھی اسی روانی اور تسلسل کے ساتھ بیان کرتے چلے جاتے ہیں جیسے رومانوی قصے۔ ضمناً سسی اور مراد کا قصہ بھی بیان کرتے ہیں۔

راوی راٹھاں، سندھ صادقاں تے چناں عاشقاں یعنی راوی کے کنارے راٹھ یعنی بہادر بستے ہیں۔ دریائے سندھ کے کنارے صادق سچے یعنی بزرگ، خواجہ غلام فرید چاچڑ سرمت، لال شہباز قلندر اور شاہ لطیف بھٹائی اور چناب کے کنارے عاشق سوہنی مہینوال سے شروع کر کے مرزا صاحباں تک۔

کھیوہ جھنگ شہر سے چند میل کے فاصلے پر جھنگ چنیوٹ روڈ پر ہے۔

حافظ برخوردار نے اس قصے کو امر کر دیا۔ یہ واقعہ زیادہ پرانا نہیں صاحباں کے بھائی شمیر کے ہاتھوں مرزا اور صاحباں کے قتل ہونے کے بعد مرزا کے باپ ونجل خاں اور مرزا کے بھائیوں سے انتقام لیا اور کھیوہ میں قتل عام کے بعد یہ گاؤں بھی جلا ڈالا۔ پرانے کھیوہ کے کھنڈر ابھی بھی زبان حال سے ماضی کے افسانے سناتے ہیں۔ حافظ برخوردار مرزا کی گھوڑی ''بکی'' کو نیلی گھوڑی لکھتا ہے۔

طالب علمی کے زمانے میں اُستاد محترم سمیع اللہ قریشی صاحب سے پوچھا:

''سر نیلی گھوڑی کہاں اور کیسی ہوتی ہے۔ میں نے آج تک نہیں دیکھی؟''

اُستاد محترم نے فرمایا ''جھلو!! کبھی چودھویں رات کی چاندنی میں سفید براق گھوڑی کو دیکھنا نیلی نظر آئے گی!''

چڑھدے مرزے خان نوں ونجل دیندا مت
بھٹھ رناں دی دوستی تے کھری جہاں دی مت
ہس ہس لاون یاریاں تے رو رو دیون دس

ایف ایس سی اور بی ایس سی سائنس پڑھ کر نہیں دی۔ بس اس قدر کہ فقط پاس ہونے کا بندوبست ہو جائے۔ دن کتابوں اور شعراء غالب و اقبال، فیض و ساحر اور خواجہ غلام فرید کے ساتھ گزرتا اور شام ٹینس کورٹ پر۔

باقاعدہ ٹینس ۱۹۶۶ء میں شروع کی۔ ٹینس میں گورنمنٹ کالج جھنگ کے گراؤنڈز کے ساتھ جس شخصیت کا چولی دامن کا ساتھ تھا اُسے جھنگ کا کوئی سپورٹس مین بھول نہیں سکتا۔ معزز شہری اور سینئر سٹیزن تھے۔ کئی دہائیوں تک وہ جھنگ کے سپورٹس گراؤنڈز کی جان رہے۔ اُن دنوں بھی اپنی عمر انہتر سال بتاتے تھے۔ اُن کی گفتگو یوں شروع ہوتی:

''جب میں ''فورٹی سکس'' میں آل انڈیا کی طرف سے دہلی میں اٹلی کی ٹینس ٹیم کے خلاف کھیلا''

ہماری جوانی کی ٹینس کو ان کی صحبت نے بوڑھا کر دیا۔ ہم سب اُن کی بہت عزت کرتے۔ خلیل الرحمن خاں صاحب سب سے پہلے ٹینس کورٹس میں پہنچ جاتے۔ غضب کی پلیسنگ کرتے۔ گیند ناممکن زاویوں پر پھینک لیتے اور جب مخالف کھلاڑی گیند تک نہ پہنچ پاتا تو اپنے مصنوعی دانت نکال کر ہنستے اور خوش ہو کر کہتے:

''یہ تو تم دو سے بھی نہ اُٹھے''

بعض اوقات تو گیند کے ساتھ نجانے کیا کرتے کہ گیند انہیں کے کورٹ میں واپس آ جاتی۔ کبھی ہم زور لگا کر پوری قوت سے نیٹ پر کھڑے ہوئے خاں صاحب کو ہٹ کرتے، وہ ریکٹ آگے کر دیتے، گیند ٹکرا کر کورٹ سے باہر جا گرتی تو رنجیدہ ہو کر کہتے:

''اب کلائی میں جان نہیں رہی''

خاں صاحب مرحوم نے ایسی ہیرا پھیری ہمیں سکھائی کہ ہم ٹینس کورٹ پر شطرنج کھیلنے لگے۔

خان صاحب سب سے زیادہ شیخ صاحب پر ناراض ہوتے اُن کا پورا نام احتیاطاً نہیں لکھا جا رہا۔ کہ ''انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو''

خاں صاحب شیخ صاحب کی ٹینس کورٹ میں بطور پارٹنر کسی حماقت پر کہتے:

''ابے تیرے باوا نے بھی کھیلی تھی کبھی ٹینس''

کوئی بھی اُن کی کسی بات کا برا نہ مانتا بلکہ جب بھی وہ ناراض ہو کر کھیلنے نہ آتے تو ہم سب انہیں منانے جاتے۔ اُن کے کمزور نظر کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے کبھی بے ایمانی کرتے، گیند کو آؤٹ کہہ دیتے تو خاں صاحب پوری آواز سے چیختے:

''ابے چونا دی گئی ہے، ہاں اگر چونا دے جائے تو ویملڈن میں قتل ہو جاتے ہیں'' اور ہم ہتھیار ڈال دیتے۔

گورنمنٹ کالج جھنگ کا چار سال کا یہ عرصہ کتابیں پڑھتے ٹینس کھیلتے گزر گیا۔

❀❀❀

گولے

محمد ممتاز راشد لاہوری

بچپن میں تو سب سے پہلے کانوں میں برف کے گولے ہی کا ذکر سننے کو ملا تھا۔ مگر پھر وقت کے ساتھ ساتھ کئی طرح کے گولے پڑھنے، سننے، برتنے اور سہنے کو ملتے رہے۔ میرے بچپن کا زمانہ 1960 کے لگ بھگ کا تھا۔ تب اوون وغیرہ نہیں تھے۔ چولہوں میں لکڑی، کوئلے یا برادہ وغیرہ جلایا جاتا تھا۔ پتھر یلے کوئلوں کا برادہ بھی ملتا تھا۔ ہماری نانی اس برادے میں کچھ پرانا ڈیزل وغیرہ ملا کر اس کوئلے کے گولے بنا لیتی تھیں اور سوکھ جانے پر یہ گولے بطور ایندھن استعمال ہوتے تھے۔ تب خواتین میں سویٹر بننے کا رواج عام تھا اور یوں اُون کے رنگ برنگے گولے بھی ہر گھر میں عام نظر آتے تھے۔ اسی طرح کشیدہ کاری کے موٹے دھاگوں کے رنگ برنگے گولے بھی۔ تب ٹی وی نہیں آیا تھا۔ ریڈیو بھی خال خال گھروں میں تھا۔ لاؤڈ اسپیکر بھی سب مسجدوں میں نہ تھے۔ اس لیے رمضان المبارک میں افطاری کے وقت سب کے کان توپ کے گولے کی طرف لگے ہوتے جو لاہور کینٹ میں کسی جگہ داغا جاتا اور لاہور میں ہر جگہ سنا جاتا تھا۔ اس کی گونج پر روزہ کھول کر اذان مغرب ہوتی اور نماز ادا کی جاتی۔ سحری کے وقت ختم ہونے کا اعلان بھی ایسا ہی ایک گولا کرتا تھا۔

میرے 1977 سے 2014 تک 37 سال قطر میں گزرے۔ وہاں افطاری کے وقت ملٹری کے کچھ جوان یہ توپ شارع کارنیش دوحہ پر لاتے اور سب کے سامنے گولہ داغتے۔ کئی کنبے بچوں سمیت یہ منظر دیکھنے وہاں پہنچے ہوتے تھے۔ 1961 میں رن کچھ اور کشمیر وغیرہ کی پاک بھارت جنگی جھڑپوں ہی میں بموں کے گولوں کا ذکر بھی سننے کو ملنے لگا تھا مگر ستمبر 1965ء کی پاک بھارت جنگ میں تو یہ گولہ باری عملی طور پر بھی دیکھی کیونکہ شالامار باغ لاہور کے عقب میں (شمال میں) واقع علاقہ دوسری دفاعی جنگی لائن بنا ہوا تھا اور اسی میں ہمارا موضع محمود بوٹی بھی تھا۔ کچھ گولے گر کر پھٹے نہ تھے بعض لوگ یہ گولے اُٹھا کر لائے اور توڑنے کے عمل میں جان گنوا بیٹھے۔ ''رانی توپ'' کے گولے داغے جاتے تو میلوں تک اس کی گونج اور دھمک محسوس ہوتی تھی۔ جنگی جہازوں سے گرائے جانے والے بموں کے گولے الگ تباہی مچاتے تھے۔ ایسی ہی جنگی صورت حال دسمبر 1971ء کی پاک بھارت جنگ میں بھی دیکھی۔ نتیجے میں سقوط ڈھاکہ ہوا۔ پھر انڈیا نے ایٹمی دھماکہ کیا۔ ایسی ہی تیاری پاکستان نے بھی کر لی۔ انڈیا نے کچھ سال بعد دوسرا ایٹمی دھماکہ کیا تو جواباً پاکستان نے بھی کام کر دکھایا اور یوں ان بڑے ''گولوں'' کی وجہ سے جنگوں کا سلسلہ رُک سا گیا۔ لاہور میوزیم کے باہر استنبول چوک مال روڈ میں ''بھنگیوں کی توپ'' رکھی ہوئی ہے جو مغلوں کے دور کی یادگار ہے۔ یہ اپنے دور کی سب سے بڑی توپ تھی اور اس کے گولے دشمن کا خوب صفایا کرتے تھے۔ انگریزوں کے دور میں باغی علماء وغیرہ کو توپوں کے دہانوں پر باندھ کر گولوں سے اُڑایا گیا تھا۔ امن کے دنوں میں توپیں سلامی کے گولوں کے لیے کام آتی ہیں۔ غیر ملکی سربراہ آئیں تو عموماً انھیں اکیس گولوں کی سلامی دی جاتی ہے۔ میلوں ٹھیلوں کی ایک تفریح ''موت کا کنواں'' ہے اس میں کنویں کی اندرونی دیوار کے گرد موٹر سائیکل سوار چکر لگاتا اور کرتب دکھاتا ہے۔ پھر ''موت کا گولہ'' بھی آ گیا اور وہ کرتب اس گولے کی دیوار کے اندر اندر لگنے لگے۔ ویسے ایک گولہ پیٹ میں گیس کا گولہ بھی ہوتا ہے۔ یہ گولہ پیٹ کے اندر گردش بھی کرتا ہے اور بندہ درد سے بے حال ہو جاتا ہے۔ بعض مائیں اپنے بے حد شرارتی بچے کو تنگ آ کر یہ بددعا بھی دیتی ہوئی سنائی دیتی تھیں ''تینوں وجے بمب دا گولہ'' مگر ظاہر ہے کہ وہ دل سے تھوڑا ہی کہہ رہی ہوتی تھیں۔ نفسیاتی لحاظ سے گولے کی کیا اہمیت ہے اس کا کچھ اندازہ نامور شاعر ''میراجی'' پر لکھے ہوئے نامور افسانہ نگار منٹو کے مضمون سے ہوتا۔ منٹو نے تفصیلاً تجزیہ کیا ہے کہ میراجی ہر وقت جو ہاتھ میں تین چھوٹے گولے پکڑے رکھتے تھے تو اس کی نفسیاتی وجہ کیا تھی۔ ''گولہ'' کا لفظ ''گولائی'' کے سبب ہی بنا ہے۔ پنجاب میں راؤنڈ اباؤٹ کو گول چکر کہا جاتا ہے۔ ممبئی وغیرہ کی ''پانی پوری'' کو پاکستان میں گول گپے کہا جاتا ہے۔ گول باغ اور گول گراؤنڈ جیسے نام کئی شہروں میں ہیں۔ ''گول مال'' کے معنی اور ہیں یعنی دغا فریب سے بنایا ہوا مال۔ ویسے گول آنکھیں اور گول چہرہ بھی ہوتا ہے اور دیگر جسمانی گولائیاں بھی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ عورت کا جسم گولائیوں اور مرد کا جسم زاویوں سے بنا

ہوتا ہے۔ سب سے ہوشربا گولائیوں کا تصور بھی خاصا ہوشربا ہوتا ہے۔ ''گولے'' کو عربی زبان میں ''کرہ'' کہتے ہیں۔ ''کرۂ ارض'' تو مشہور لفظ ہے یعنی یہ گول زمین۔ اسی طرح عربی میں گیند کو بھی کرہ ہی کہتے ہیں۔ فٹ بال کو ''کرۃ القدم'' اور ہینڈل بال کو ''کرۃ الید'' کہا جاتا ہے۔ ویسے ایک لفظ ''قرعہ'' بھی ہے۔ یعنی کسی کے نام کا ''قرعہ'' نکلنا یا قرعہ اندازی کرنا وغیرہ۔

''گولہ'' سے ملتا جلتا لفظ ''گولا'' ہندی زبان کا ہے جس کے معنی ''غلام'' کے ہیں۔ تاش کے پتوں میں ''جوکر'' کو تاش کے دیسی کھلاڑی ''گولا'' بھی کہتے ہیں۔ ''گولہ'' کی مونث ''گولی'' لونڈی یا نوکرانی کے معنوں میں ہے۔ اب ''گولیاں'' کنیزیں بھی ہوتی ہیں۔ گولیاں پستول وغیرہ کی بھی ہوتی ہیں۔ بال بیرنگوں کے اندر بھی ہوتی ہیں۔ بچوں کی ٹافیوں، کینڈیوں وغیرہ کی شکل میں بھی ہیں، دوائیوں کی شکل میں بھی ہیں اور بنٹوں کنچوں وغیرہ کو بھی کئی بچے گولیاں کہہ دیتے ہیں۔ ایک لفظ ''گوہلاں'' بھی ہے۔ یہ برگد اور پیپل جیسے ایک درخت کا پھل ہوتا ہے۔ عموماً نہیں کھایا جاتا۔ ذرا پک جائے تو بچے شوقیہ طور پر توڑ کر کھا لیتے ہیں۔ گولے اور گولائی کا تعلق پہلے بیان ہو چکا ہے۔ گولے اور ''گل'' کا کوئی خاص تعلق تو نہیں، کچھ صوتی ہم آہنگی ضرور ہے اور یوں ''گل'' سے کئی لفظ بن جاتے ہیں۔ مثلاً گلکاریاں، گلگلے، گل بوٹے، گلبرگ، گلستان، گل بکاؤلی، گلال، گلاب یا گل افشانی وغیرہ وغیرہ۔ ایک حتمی معنی کا لفظ ''گل کھلانا'' بھی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہماری یہ تحریر بھی ایسی ہی کسی داستان کا شاخسانہ بن جائے اس لیے ''گولہ کہانی'' یہیں ختم۔

جب جکڑ لیتی ہیں بانہیں آپ کی
کیا مزے کی ہیں صدائیں آپ کی

ہم نہ سمجھیں گے تو پھر سمجھے گا کون؟
کہہ رہی ہیں جو نگاہیں آپ کی

آپ نے انگڑائی لی تو ہم گئے
جان لیوا ہیں ادائیں آپ کی

آپ کے صدقے ملی ہم کو حیات
اس لیے لی ہیں بلائیں آپ کی

خونِ دل سے سینچ کر ہم نے گلاب
آج مہکائی ہیں راہیں آپ کی

ہم زمانے کی جفا سے کیوں ڈریں
ہم کو حاصل ہیں وفائیں آپ کی

ہو نہیں سکتا ہمیں کچھ بھی کنول
ساتھ ہیں جب تک دعائیں آپ کی

ڈاکٹر کنول فیروز/لاہور

ہر شخص پسِ پردۂ در گھوم رہا ہے
آتا نہیں ظاہر میں نظر گھوم رہا ہے

دنیا تہہ و بالا ہوئی جاتی ہے جو میری
میں گھوم رہا ہوں کہ یہ سر گھوم رہا ہے

کچھ یوں ہے ترے ہجر میں اندازِ تخیل
طائر لیے منقار میں پر، گھوم رہا ہے

کیا شکوہ ہو گردش کا، ازل سے فلک پر
ساکت نظر آتا ہے مگر گھوم رہا ہے

اُس نے کبھی دیکھا تھا جھجکتی سی نظر سے
اُس وقت سے یہ دل یہ جگر گھوم رہا ہے

دل وصل کی خواہش میں ہوا جاتا ہے بے کل
اک بار نہیں بار دگر گھوم رہا ہے

مدت سے ٹھکانہ نہیں ناصر کا کہیں بھی
کاندھے پہ اُٹھائے ہوئے گھر گھوم رہا ہے

ناصر زیدی/لاہور

زرنقش ادبی سلسلہ
یونس اعجاز نمبر
قیمت فی شمارہ: 300روپے
مدیر سرور ارمان

ماہنامہ بیاض، لاہور
مدیر عمران منظور
قیمت فی شمارہ: 100روپے

جمیل قمر/کینیڈا

تم ہماری نوجوانی دیکھتے میز پر فوٹو پرانی اور ہے

جمیل قمر نے اپنی شعری بساط کو زیادہ تر چھوٹی بحروں سے ترتیب دیا ہے اور چند الفاظ میں مکمل بات کہنے کے ہنر سے بخوبی آگاہ ہیں۔ جمیل قمر ساری زندگی عازمِ سفر رہے ہیں اور جہاں بھی قیام کیا وہاں کی تہذیب اور سماج سے کچھ خوبصورت احساسات کو اپنے ساتھ گٹھڑی میں باندھ کر منزل در منزل سفر کرتے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں اثر پذیری کے ساتھ تنوع کا پہلو بھی نمایاں ہے۔ جمیل قمر کے مزاج میں جستجو کا بہت عمل دخل ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان کے ارد گرد رنگ و بو کا ایک حلقہ ہو جس کی جاذبیت اور سحر سے سارا دن ماحول معطر رہے۔ ہم اکثر دیکھتے ہیں کہ معمولی سی بات بدگمانی بن کر دلوں میں فاصلے پیدا کر دیتی ہے اور اگر رو برو بیٹھ کر اس کا تذکرہ کیا جائے تو یہ بدگمانی دور ہو سکتی ہے۔

زندگی کی ترجمانی اور ہے
غم کے لمحوں کی کہانی اور ہے
آرزو تو قابلِ تسخیر تھی
پر کسی کی مہربانی اور ہے
چشم و دل کی ایک سی تاثیر ہے
ہے لہو کچھ اور پانی اور ہے
جیت کر جیتے نہیں اہلِ وفا
جستجو میں کامرانی اور ہے
واقعاتِ شب یہاں کچھ اور ہیں
روزِ روشن کی کہانی اور ہے
تم ہماری نوجوانی دیکھتے
میز پر فوٹو پرانی اور ہے
اور تھا اس کی گلی کا راستہ
ہم نے جس میں خاک چھانی اور ہے
ان غموں کا کیا مداوا ہو قمر
ان غموں کی سرگرانی اور ہے

خود سے لاچار ہیں تو ہم ہی ہیں
ہائے بیکار ہیں تو ہم ہی ہیں
چل پڑے ساتھ اپنے سائے کے
خود کو درکار ہیں تو ہم ہی ہیں

اپنی منزل کے خود ہی دشمن ہیں
اپنا معیار ہیں تو ہم ہی ہیں
اور کس کا ہے حال ہم جیسا
تیرے بیمار ہیں تو ہم ہی ہیں
مطمئن ہیں لگا کے دل تم سے
اور بیزار ہیں تو ہم ہی ہیں
کس رعونت سے کہہ رہے ہیں وہ
گر طرف دار ہیں تو ہم ہی ہیں
تجھ کو معلوم ہی نہیں ہے قمر
گر ترے یار ہیں تو ہم ہی ہیں

ہمارے خواب ٹوٹے ہیں
بڑے بے تاب ٹوٹے ہیں
بڑی لمبی کہانی ہے
غموں کے باب ٹوٹے ہیں
عتابِ رہروی مت پوچھ
مرے اسباب ٹوٹے ہیں
تکلف اٹھ گیا یارو
سبھی آداب ٹوٹے ہیں
شکستہ کشتیوں پر کیوں
بڑے گرداب ٹوٹے ہیں

حسن کو بے مثال کرتے ہیں
اہلِ دل بھی کمال کرتے ہیں
آس قوت کو چھین لیتی ہے
آسرے بھی نڈھال کرتے ہیں
آ کہ پھر بیٹھ کر کہیں تنہا
بیتے لمحے بحال کرتے ہیں
غیر کو اس قدر نہیں توفیق
اپنے ہی پائمال کرتے ہیں
آپ اپنا جواب ہیں ہم لوگ
لوگ پھر بھی سوال کرتے ہیں

اک بدن کا قیام ہے گویا
بے خودی کا مقام ہے گویا
احتراماً خموش ہیں دونوں
دل سے دل کا سلام ہے گویا
اہلِ دل جس کو پیار کرتے ہیں
دہر کا انتقام ہے گویا
مختصر ہے جنون کی منزل
ہر سفر چار گام ہے گویا
زلف جلوہ فروز چہرے پر
ایک جا صبح شام ہے گویا

نجمہ شاہین ڈاکٹر/ڈیرہ غازی خاں

آس اب بجھنے لگی، وہ لوٹ کر آئے نہیں
جھیل پراب بھی وہ اک تنہا شجر ہے اور میں

ابتدا درد ہے، انتہا درد ہے
عشق کا درد تو لادوا درد ہے
میں نے پوچھا وفا کا صلہ جو کبھی
اُس نے ہنس کر یہ مجھ سے کہا درد ہے
پیار سے عشق تک جابجا روشنی
یار سے عشق تک جا بجا درد ہے
یہ نیا پھول ہے اور یہ خوشبو نئی
یہ نئی شام ہے اور نیا درد ہے
زخم کیسا ہے بھرتا نہیں ہے کبھی
درد ہوتا نہیں ہے یہ کیا درد ہے
میں تو ڈرنے لگی اس کی تعبیر سے
پیار آنکھوں میں جب سے بنا درد ہے
ایک پل میں کہاں کھو گئی ہے خوشی
اب تو اُلفت کی بس اک سزا درد ہے
چھوڑ شاہیں وفا کا تو اب تذکرہ
بے وفا ہے خوشی، باوفا درد ہے

چاندنی چپ رہی، روشنی چپ رہی
میری ہر بات پر زندگی چپ رہی
ہم تو گھٹ گھٹ کے اک روز مر جائیں گے
اس گلشن میں اگر آنکھ بھی چپ رہی
درد میرا بیاں ان سے کب ہو سکا
شعر خاموش تھے، شاعری چپ رہی
اک یقیں تھا پلٹ آئے گا وہ ابھی
میں تو بس اس کی رہ دیکھتی چپ رہی
مجھ کو مقتل میں جس روز بھیجا گیا
سوچتی ہوں میں کیوں اُس گھڑی چپ رہی
میں نے شاہین جیون گزارا ہے یوں
نیند میں بات کی، جاگتی چپ رہی

کہیں پہ گرد کہیں پر ہوا بناتی ہوں
میں خود کو اب تو بس اپنے سوا بناتی ہوں
کہیں پہ تارے کہیں پر ہیں آس کے جگنو
خزاں میں بھی میں گلوں کی فضا بناتی ہوں
بکھر گئے تھے کسی نام کے حروف کہیں
اب ان کو جوڑ کر اک آئینہ بناتی ہوں
یہ طے ہے اس کو اگر لوٹ کر نہیں آنا
تو کس لیے میں دعا کو عصا بناتی ہوں
اُجالتا ہے یہ تاریکیاں مرے دل کی
تمہاری یاد کو ہر پل دیا بناتی ہوں
جب اپنے اشک چھپاتی ہوں مسکراہٹ سے
تو اپنے درد کو اپنی دوا بناتی ہوں
تراش کر کسی پتھر کے ایک پیکر کو
کمالِ عشق سے اس کو خدا بناتی ہوں
کہ خواب میں رہے تادیر گفتگو تجھ سے
ذرا سی بات کو میں واقعہ بناتی ہوں
سنا تھا میں نے جو شاہین ایک لمحے کو
اس ایک لمحے کو اپنی صدا بناتی ہوں

منظر تمام آج تک آنکھوں پہ بوجھ ہیں
جتنے بھی خواب ہیں مری پلکوں پہ بوجھ ہیں
اُترے گا چاند تو مری بھر آئے گی یہ آنکھ
تارے فلک سے ٹوٹ کر راتوں پہ بوجھ ہیں
سوچوں پہ نقش ہیں وہ جو پل تھے وصال کے
دکھ ہجر کے تمام ہی لمحوں پہ بوجھ ہیں
باتیں اُس ایک یاد کی باتوں کا حسن ہیں
یادیں اُس ایک بار کی یادوں پہ بوجھ ہیں
نجمہ کہیں بھی جھوٹ کا جن پر گمان ہو
ایسے تمام لفظ ہی شعروں پہ بوجھ ہیں

رت جگے، آنسو، دعائے بے اثر ہے اور میں
عشق لاحاصل ہے، اک اندھا سفر ہے اور میں
چھوڑ کر آئی ہوں ہر منزل کو میں جانے کہاں
یہ دلِ سودائی اب تک بے خبر ہے اور میں
اب تلک رستے وہی اور عکس آنکھوں میں وہی
اور خود کو ڈھونڈتی میری نظر ہے اور میں
گم شدہ منظر میں اب تک ہے بھٹکتی زندگی
اجنبی رستوں کا اک لمبا سفر ہے اور میں
آس اب بجھنے لگی، وہ لوٹ کر آئے نہیں
جھیل پر اب بھی وہ اک تنہا شجر ہے اور میں
کیا کہوں شاہین جس پر تھا بہت ہی اعتبار
وہ زمانے کے لیے اب معتبر ہے اور میں؟

شبین سیف / کراچی

تم نے اک عمر مرے دل پہ حکومت کی ہے
تم کو پل بھر میں بھلایا تو نہیں جا سکتا

تیرگی کو ستارہ کرتے ہیں
آؤ اُس سے کنارا کرتے ہیں
کیسے وہ لوگ ہیں جو چاہت میں
تیسرے کو گوارا کرتے ہیں
کس طرح ہم جئیں گے اُس کے بنا
آج پھر استخارا کرتے ہیں
عشق بس ایک بار ہوتا ہے
لوگ کیسے دوبارہ کرتے ہیں
مسئلہ جو بھی تیرا میرا ہے
آؤ اُس کو ہمارا کرتے ہیں
اُس کے جانے کے بعد دیر تلک
اُس کی نظریں اُتارا کرتے ہیں
ہم تصور میں اُس کے ہاتھوں سے
اپنی زُلفیں سنوارا کرتے ہیں
دوست ہوتے ہوئے، بھنور میں ہم
دشمنوں کو پکارا کرتے ہیں
کس قیامت کا حوصلہ ہے کہ ہم
آپ کے بن گزارا کرتے ہیں
بندھے آتے ہیں کچے دھاگے سے
آپ جب بھی اشارا کرتے ہیں
آزما لو کہ آزمائش میں
اپنے ہی بے سہارا کرتے ہیں

روشنی بن کر بکھرنے کے لیے
زندگی ہے عشق کرنے کے لیے
انگلیوں کو ہم قلم کرتے رہے
چاہتوں میں رنگ بھرنے کے لیے
توڑ ڈالا ہے خود اپنے آپ کو
ایک گھر تعمیر کرنے کے لیے
آئینے میں روبرو تھا اجنبی
آج جب سوچا سنورنے کے لیے
دوستی طوفاں سے کرنی پڑ گئی
ساحلوں پر پیر دھرنے کے لیے
میں وظیفے پڑھ رہی ہوں رات دن
آپ کے دل میں اُترنے کے لیے
جانتی ہوں اک بہانہ چاہیے
آپ کو مجھ سے مُکرنے کے لیے
سرد لہجہ تھا بہت اُس کا شبینؔ
آج ہم کو ڈوب مرنے کے لیے

کس طرح ہاتھ ترا ہاتھ پہ رکھا جائے
فیصلہ اگلی ملاقات پہ رکھا جائے
رہنمائی کی ضرورت تو نہیں شہروں کو
اب تو جگنو کو مضافات میں رکھا جائے
جو فقط جسم سمجھتا ہے کسی عورت کو
ایسے کم ظرف کو اوقات میں رکھا جائے
ایک دن رکھ کے ہتھیلی پہ دہکتا سورج
اُس کو تاروں بھری بارات میں رکھا جائے
مردہ جذبوں کو ملے پھر سے نمو کی دولت
پھر انھیں عشق کی برسات میں رکھا جائے
ہاتھ اُٹھانے سے فقط بات کہاں بنتی ہے
درد بھی اپنی مناجات میں رکھا جائے
جو ہتھیلی کی لکیروں کو بدل کر رکھ دے
ایک ایسا بھی ہنر ہاتھ میں رکھا جائے
آؤ یہ جیت پس عشق چھپا کر رکھیں
اور سرِ بام اُسے مات میں رکھا جائے
اپنے رشتوں کو تلاطم سے بچانے کے لیے
ایک ٹھہراؤ سا جذبات میں رکھا جائے
عقل کہتی ہے کہ میں اُس سے کنارا کرلوں
دل یہ کہتا ہے اسے ساتھ میں رکھا جائے

عمر بھر بوجھ اُٹھایا تو نہیں جا سکتا
ہر تعلق کو نبھایا تو نہیں جا سکتا
آپ اس بار بھی دیوار میں چنوا دیں مجھے
اب کے بھی سر یہ جھکایا تو نہیں جا سکتا
روز مرنے کا ہنر جس نے سکھایا ہے مجھے
اُس کا احسان بھلایا تو نہیں جا سکتا
چشم بینا ہے مگر عقل سے نابینا ہیں
آئینہ اُن کو دکھایا تو نہیں جا سکتا
تم نے اک عمر مرے دل پہ حکومت کی ہے
تم کو پل بھر میں بھلایا تو نہیں جا سکتا
جن کو الفاظ سے ڈسنے کا ہنر آتا ہے
ہاتھ اب اُن سے ملایا تو نہیں جا سکتا
جس قدر سنگ زنی چاہیے کرلیں مجھ پر
سنگ زاری کو رُلایا تو نہیں جا سکتا
ہوں مکیں جن میں کئی سال سے زندہ لاشیں
اُن مکانوں کو سجایا تو نہیں جا سکتا
جس کی خاموشی میں آسیب سکوں کرتے ہوں
ایسا ویرانہ بسایا تو نہیں جا سکتا
تو بتا عشق نہیں تو، تو خدا ہے میرا
اب تجھے ہاتھ لگایا تو نہیں جا سکتا

جبار واصف/رحیم یار خاں

گھر نئے رُخ سے میں تعمیر اگر کرتا ہوں
کوئی رشتہ پسِ دیوار بدل جاتا ہے

جب کسی شخص کا معیار بدل جاتا ہے
دل بدل جاتا ہے دلدار بدل جاتا ہے
گھر نئے رُخ سے میں تعمیر اگر کرتا ہوں
کوئی رشتہ پسِ دیوار بدل جاتا ہے
میں بھی کر لیتا ہوں ہر بار بھروسہ اُس پر
اور وہ شخص بھی ہر بار بدل جاتا ہے
کیسے اُس قوم کے حالات بدل سکتے ہیں
روز جس قوم کا سردار بدل جاتا ہے
اپنی پیشانی پہ سچ لکھنے کی آیت لکھ کر
کس کے کہنے پہ یہ اخبار بدل جاتا ہے
جس کے ہاتھوں میں امانت ہو قلم کی حرمت
زر کی خاطر وہ قلم کار بدل جاتا ہے
باپ سے ملتی ہے شوہر سے اجازت لے کر
بیٹی رُخصت ہو تو حق دار بدل جاتا ہے
اپنے پیروں پہ کھڑا ہوتے ہی بیٹا اکثر
اپنے ماں باپ سے گفتار بدل جاتا ہے
بیچ کر خود کو جو بھرتی ہے شکم بچوں کا
اُس کا ہر روز خریدار بدل جاتا ہے
جو بھی کانٹا ہو اُسے پھول عنایت کر دو
ماں یہ کہتی تھی کہ یوں خار بدل جاتا ہے
تو جو بدلا ہے تو حیران نہیں ہے واصف
دشتِ غربت میں ہر اک یار بدل جاتا ہے

دبلی پتلی سہمی سہمی پیاری پیاری لڑکیاں
مفلسی منڈی میں لائی پھر کنواری لڑکیاں
پھر ہوس نے اہلِ زر کی رُخ کیا بازار کا
سج گئیں گجروں میں پھر غربت کی ماری لڑکیاں
شام ڈھلتے عصمتوں کی رُخصتی طے ہو گئی
اور مغلظ خواہشوں کے گھر سدھاری لڑکیاں
کالی کالی چادروں پر سرخ دھبے جب پڑے
بن گئی پھر عورتیں شب بھر میں ساری لڑکیاں
روز واصف نوچتے ہیں جنسیاتی بھیڑیے
شدتِ جذبات میں جذبوں سے عاری لڑکیاں

سنو بیٹی!
مجھے تم سے ضروری بات کہنی ہے
تمہیں معلوم ہے بیٹی
تمہارا باپ شاعر ہے
کہ جس نے عمر بھر الفاظ کے سکے کمائے ہیں
وہی سکے جو اُس بازار میں چلتے نہیں جس میں
کبھی ایسی دُکانیں ہیں
جہاں کاغذ کے ٹکڑوں کے عوض کچھ خواب بکتے ہیں
جہاں پر بیٹیوں کے قیمتی ارمان بکتے ہیں
سنو بیٹی!
تمہارے خواب اور ارمان
اُن لفظوں کے سکوں سے خریدے جا نہیں سکتے
جو میرا کل اثاثہ ہیں
سنو بیٹی!
تمہارا باپ شاعر ہی نہیں مجرم بھی ہے جس نے
وہ سب سکے کمائے ہیں
جو دنیا کے کسی بازار میں بھی چل نہیں سکتے
خوشی میں ڈھل نہیں سکتے
سنو بیٹی!
مرا اے کاش! لفظوں سے کوئی رشتہ نہیں ہوتا
میں منڈی میں تجارت کر کے وہ کاغذ کماتا جو
ہر اک ارمان، ہر اک خواب کی قیمت چکا سکتے
تمہارا گھر سجا سکتے
تمہیں دلہن بنا سکتے

ترے بغض کی ہے دوا کوئی، نہ تری انا کا علاج ہے
اے مریضِ کہنہ سیاہ رو، ترا کل جو تھا وہی آج ہے
کبھی ایک راہ کے ہم سفر، کبھی ایک دوجے سے بے خبر
یہ مسافروں کا چلن ہے یا، کوئی قافلوں کا رواج ہے
وہ سبقِ خودی کا ضرور میں، کسی روز تجھ سے پڑھوں گا پر
ابھی گھر میں بھوک کا راج ہے، مجھے یہ بتا کہ اناج ہے؟
جو امیر ہیں وہ صمیم ہیں، جو غریب ہیں وہ اثیم ہیں
یہ ہے کیسی رسمِ معاشرت، یہ سماج کیسا سماج ہے
مجھے شاعری کا شعور تھا تجھے زرگری پہ عبور تھا
مری خاک میں ہے گزر بسر، ترے سر پہ سونے کا تاج ہے
مرا بیٹا لاکھوں میں ایک ہے، تری بیٹی بھی بڑی نیک ہے
مرے بھائی بس مجھے یہ بتا، ترے پاس دینے کو داج ہے؟

شفیق عطاری / شنکیاری

ملنے کے بعد کس کو رہیں گے شفیق یاد
جانے کے بعد ہم کو پکارا کرے گا کون

کردار میں مر جاؤں کہانی کے لیے میں
زندہ تو رہوں یاد دہانی کے لیے میں
لایا ہوں تجھے کھینچ کے واپس میں کہاں سے
عمر رواں اپنی جوانی کے لیے میں
اب نام نہیں میرا ترے نام کے آگے
اب تو ہوں کسی یاد پرانی کے لیے میں
ساحل کی بہت یاد ستاتی ہے مجھے یار
دریا پہ نہیں جاؤں گا پانی کے لیے میں
وہ حسن تکلم سے گرفتار کرے ہے
جاؤں گا وہاں شعلہ بیانی کے لیے میں
رکھے گا یہاں کون عطاری کو بھلا یاد
تصویر کسے دوں گا نشانی کے لیے میں

رنگ تصویر میں نہ بھرتا میں
تجھ سے اُلفت اگر نہ کرتا میں
جس طرح تم سدھارتے ہو مجھے
اس طرح تو نہیں سدھرتا میں
حد میں رکھتا ہوں اپنے دشمن کو
حد سے آگے نہیں گزرتا میں
زندگی تو نہیں ملی مجھ کو
زندگی تجھ میں رنگ بھرتا میں
مر گیا مجھ پہ مرتے مرتے وہ
بچ گیا اس پہ مرتا مرتا میں
کہہ دیا جو بھی اس سے کہنا تھا
اور کتنا شفیق ڈرتا میں

دکھوں سے کب تلک دل کو ترے بھاری کروں گا میں
کسی بھی حال میں اب تو وفاداری کروں گا میں
تمہارے نام سے بس آشنا ہوں گے یہاں اک دن
تمہارے نام کا سکہ یہاں جاری کروں گا میں
تمہارے ہاتھ کی چوڑی تمہاری آنکھ کا کاجل
تمہارے واسطے اک دن خریداری کروں گا میں
مری خاطر تو روئے گا بھلا کب تک یہاں تنہا
بھلا کب تک بتا تیری دل آزاری کروں گا میں
عطاری کی انا کو مار دوں گا میں تیری خاطر
تیری خاطر عدو سے بھی رواداری کروں گا میں

ہجر و وصال ساتھ گوارا کرے گا کون
اس کشمکش میں آج کنارا کرے گا کون
لائے گا کون گھر سے بلا کر انھیں یہاں
یہ خاص کام آج ہمارا کرے گا کون
آنکھوں سے کون مجھ کو بتائے گا دل کی بات
آنکھوں سے تیرے جیسا اشارا کرے گا کون
اب مجھ کو اپنی جان پکارے گا کوئی جان
اب مجھ کو اپنی جان سے پیارا کرے گا کون
یہ دیکھنا ہے میری ضرورت کسے ہے اب
یہ دیکھنا ہے مجھ سے کنارا کرے گا کون
ملنے کے بعد کس کو رہیں گے شفیق یاد
جانے کے بعد ہم کو پکارا کرے گا کون

چھپے رستم بھی اپنے خول سے باہر نکل آئے
ہمارے بعد پھر ان چیونٹیوں کے پر نکل آئے
افق کے پار ہی رہنا پڑے گا اب ہمیں شاید
تعاقب میں ہماری یاد کے لشکر نکل آئے
گھمایا ہے ہمیں کوزہ گروں نے چاک پر پھر سے
انھیں لگتا ہے کے ہم اب ذرا بہتر نکل آئے
کوئی بارہ دری ہوگی یا شیشے کا محل شاید
زمیں کھودی تو نیچے کانچ کے پتھر نکل آئے
ہماری شاعری پہ پھر کسی نے کچھ نہیں بولا
کلام میر ہی جب ہاتھ میں لے کر نکل آئے
ہمیں جب دیکھنے آیا کوئی اپنے لیے دلبر
تری تصویر اپنی آنکھ میں لے کر نکل آئے

ماہنامہ **شاداب**
مدیر اعلیٰ: ڈاکٹر کنول فیروز
قیمت: -/60 روپے
477 جہانزیب بلاک جرنلسٹ کالونی
علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور

اسد علی باقی / لاہور

ان کو تو کارِ عشق میں چھٹی ہوئی نصیب
ہم تھے کہ ہم سے کوئی بہانہ نہیں ہوا

میری آنکھوں میں نمی رہنے دے
کچھ محبت میں کمی رہنے دے
ہجر رہنے دے، میری آنکھوں میں
آگ سینے میں دبی رہنے دے
حُسن یوسف کا بتانا کچھ مت
عمر اُلفت کی ڈھلی رہنے دے
دکھ کی باتیں نہ خوشی سے کر تو
غم کے چہرے پہ ہنسی رہنے دے
دل سجاتے ہیں تری آمد پر
اس برس دل کی گلی رہنے دے
دوسرا عشق بھی کرنا ہے ابھی
زندگی تھوڑی بچی رہنے دے
رات باقی ہے ابھی باقیؔ اور
بادہ یاراں کو چلی رہنے دے

اگر میں پیار کا اظہار بار بار کروں
وہ بے قرار بہت ہے میں بے قرار کروں
تمہارے سامنے کرتے ہیں اس سے بات چلو
تمہارے سامنے اس کو میں شرمسار کروں
عدو ہی دوست ہے اور دوست ہی ہے میرا عدو
میں سوچتا ہوں کہ میں کس کا اعتبار کروں
میں چاہتا ہوں کہ میں اس سے دور دور رہوں
وہ چاہتا ہے کہ میں اس کو داغ دار کروں
پھر ایک بار اُسے اور کام دوں میں کوئی
پھر اعتبار میں اُس کا بس ایک بار کروں
میں چاہتا ہوں کہ اک پل نہ دور جاؤں اسدؔ
وہ چاہتا ہے کہ اس کا میں انتظار کروں

تازہ غزل نہیں تو پرانی سنا مجھے
ورنہ تو آج کوئی کہانی سنا مجھے
مجھ سے مرا نہ پوچھ مجھے کچھ پتہ نہیں
تو اپنا حال رات کی رانی سنا مجھے
تیری غزل ہے تو نے کہی ہے اگرچہ یہ
دو چار شعر اس کے زبانی سنا مجھے
بچپن کو چھوڑ کر میں ترے پاس آ گیا
تو اپنا حال میری جوانی سنا مجھے
اس کربلا کی خاک پہ باقیؔ کے پاس بیٹھ
اے دوست کربلا کی کہانی سنا مجھے

اس کی گلی کو چھوڑ کے جانا نہیں ہوا
شوقِ وصالِ یار روانہ نہیں ہوا
اتنے دنوں کے بعد وہ آیا یہ پوچھنے
اتنے دنوں سے آپ کا آنا نہیں ہوا
ان کو تو کارِ عشق میں چھٹی ہوئی نصیب
ہم تھے کہ ہم سے کوئی بہانہ نہیں ہوا
بھولا نہیں ہوں آج بھی گزری اذیتیں
یہ واقعہ بھی اتنا پرانا نہیں ہوا
تو بھول بھی گیا ہے مری موت کا سبب
کل کی تو بات ہے یہ زمانہ نہیں ہوا
باقیؔ خبر نہ لایا کوئی میرے یار کی
اُس کا کسی سے ملنا ملانا نہیں ہوا

تو بھی کسی کے پیار میں ہارا ہوا ہے کیا
اس کھیل میں تجھے بھی خسارہ ہوا ہے کیا
کیا تم بھی آشنا ہو میرے نام سے یہاں
پہلے بھی میرا نام پکارا ہوا ہے کیا
کم تر سمجھ رہے ہو امیرانِ شہر کیوں
دامن تمہارے در پہ پسارا ہوا ہے کیا
ہم مر گئے ہیں کارِ محبت میں آخرش
نقصان اس میں کوئی تمہارا ہوا ہے کیا
رنج و الم کے ساتھ ہی کاٹی ہے زندگی
آہ و فغاں سے اپنا کنارا ہوا ہے کیا
باقیؔ کسی نے پیار سے دیکھا ہے کیا تجھے
باقیؔ کسی کو جان سے پیارا ہوا ہے کیا

حسن دیوانگی معیار اُٹھا لایا ہوں
میں ترے عشق میں بازار اُٹھا لایا ہوں
تو مرے واسطے اک پھول نہیں لایا کبھی
میں ترے واسطے گلزار اُٹھا لایا ہوں
گھر کی دیوار مکمل نہ ہوئی مدت سے
اپنے ہمسائے کی دیوار اُٹھا لایا ہوں
جلدی جلدی میں بہت کچھ ہی وہاں چھوڑ دیا
آتے آتے میں ترا پیار اُٹھا لایا ہوں

بقیہ انٹرویو ظفر اقبال

ظفر اقبال: تجربہ جو میں نے کیا وہ شاعری کے حوالے سے کیا ہے اور ہر تجربہ آدمی اپنی کسی ضرورت یا مجبوری کے تحت کرتا ہے یا سمجھتا ہے کہ اس میدان میں کسی تخلیقی تبدیلی یا کایا کلپ کی ضرورت ہے اور جو شعراء یہ سمجھتے ہیں کہ وہ کوئی نیا تجربہ کیے بغیر بھی تسلی بخش طور پر اپنا تخلیقی سفر جاری رکھ سکتے ہیں وہ تجربہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ میں نے مثلاً زبان کے حوالے سے محسوس کیا کہ مروج اور پرانی زبان نہ صرف یہ کہ میرے ساتھ نہیں چل سکتی بلکہ نئی شاعری کے لئے زبان کا نیا ہونا بھی اس حد تک ضروری ہے کہ اس کا طریقہ استعمال کم از کم نیا ہو اور زبان کے حوالے سے ہمارے ہاں بے جا (Taboos) پائے جاتے ہیں۔ اس سے گلو خلاصی کو میں نے بہت ضروری سمجھا کیونکہ میں نے محسوس کر لیا تھا کہ زبان کے حوالے سے اگر کھل کھیلنے کی ہمت اور اندازنہ اپنایا جائے تو آپ زیادہ دیر اور زیادہ دور تک سامان رسائی حاصل نہیں کر سکتے۔ چنانچہ یہ بات میرے تجربے میں آئی کہ وہ سرچشمے یعنی مقامی زبانیں جنہوں نے اردو کی آبیاری کی تھی ایک وقت ایسا آیا کہ اردو کو اردوئے معلی کہتے ہوئے یہ سرچشمے اس پر بند کر دیے حالانکہ اردو اپنے طور پر کوئی زبان نہیں تھی بلکہ بہت سی زبانوں اور بولیوں کا ایک مجموعہ تھی۔ جو عوام کی اکثریت میں بہت تیزی سے مقبول ہوئی اور پھیلی۔ ان دروازوں کو بند کرنے کی وجہ سے میں نے محسوس کیا کہ اس زبان کے بہت سے الفاظ کثرت استعمال سے گھس چکے ہیں اور انہوں نے معنی دینا بند کر دیا ہے چنانچہ میں نے ان زبانوں اور بولیوں، الفاظ، لب ولہجہ، محاوروں اور روزمرہ (Flood Gate) اس زبان پر دوبارہ کھول دیا۔ جس کی پہلی مثال میرے دوسرے شعری مجموعے "گلافتاب" میں دیکھی اور محسوس کی جا سکتی ہے۔ ان میں میں نے زیادہ تر پنجابی زبان کے استعمال کے امکانات کا جائزہ لیا ہے۔ بلکہ پنجابی کے وہ لفظ جو اردو میں متروک ہو چکے تھے ان کے بارے میں مجھے یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ دراصل یہ تو بہت عرصے سے اردو میں استعمال ہوتے رہے ہیں جن کا استعمال بعد میں ترک کر دیا گیا یہ اشفاق احمد کی ایک چھوٹی سی کتاب "اردو کے خوابیدہ الفاظ" سے مجھے علم ہوا۔

ارژنگ: لفظوں کو غیر متروک قرار دینے کا اختیار کس کے پاس ہے؟

ظفر اقبال: کچھ فیصلے ایسے ہوتے ہیں جو عمومی سطح پر نہیں کئے جاتے بلکہ تخلیق کاروں اور مصنفین کی سطح پر کیے جاتے ہیں اور انہیں بدلا یا ان کی کایا کلپ بھی اسی سطح پر ہوتی ہے اور میں نے اسی نظریے کے تحت بطور ایک مصنف اور تخلیق کار کے اس تبدیل شدہ صورت حال کو دوبارہ روایت دینے کی کوشش کی۔ یہ کام زیادہ تر نقاد حضرات کرتے ہیں۔ جو اپنے طور پر زبان کے مدو جزر اور الفاظ کے سکہ رائج الوقت ہونے کے بارے میں وقتاً فوقتاً فیصلے کرتے رہتے ہیں۔

ارژنگ: گویا اس طرح آپ نے عوامی زبان کو ادبی زبان بنا دیا ہے؟

ظفر اقبال: یہ عمل چلتا رہتا ہے عوامی زبان ادبی زبان بنتی رہتی ہے اور ادبی زبان عوامی۔ کہا بھی جاتا ہے کہ زبان میں کسی بھی تبدیلی کا عمل عوامی سطح پر ہوتا ہے اور اس میں شعوری کوششوں کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا لیکن ایک تخلیق کار چونکہ مستقبل بیں ہوتا ہے اس لیے وہ آنے والی ضروریات اور صورت حال کو سو پچاس سال پہلے بھی دیکھ سکتا ہے۔ وقت نے ثابت کر دیا کہ میرا نقطہ نظر غلط نہیں تھا وہ اس طرح سے کہ اب آپ دیکھتے ہیں کہ پاکستان میں اردو عوامی سطح پر بھی اب وہ اردو نہیں ہے جو پچاس سال پہلے بولی اور لکھی جاتی تھی حتیٰ کہ اخباری زبان تک تبدیل ہو گئی ہے اور یہ عمل پاکستان کے تمام صوبوں میں یکساں طور پر ہوا ہے۔ یعنی پنجاب میں بولی اور لکھے جانے والی زبان اس طرح تبدیل ہوئی ہے کہ اس میں پنجابی کے بے شمار لفظ لب و لہجے محاورے اور انگ شامل ہو گئے ہیں جو پہلے نہیں تھے جب کہ دوسرے صوبوں سندھ اور خصوصاً سرحد میں بھی یہی کچھ ہوا حتیٰ کہ سرحد پار بھارت میں بھی اخبارات ریڈیو، ٹیلی ویژن اور شعر ادب میں جو اردو زبان کارفرما ہوئی ہے وہ حیرت انگیز حد تک تبدیل ہو چکی ہے اور اس میں ہندی، سنسکرت، پنجابی اور انگریزی کے الفاظ اور لہجے کثرت کے ساتھ شامل ہو گئے ہیں۔ میرا عرض کرنے کا مقصد یہ تھا کہ زبان میں تبدیلی کا عمل شعوری (تخلیقی سطح پر) اور عوامی یعنی بول چال کی سطح پر برابر جاری رہتا ہے اور ان دونوں کوششوں کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔ پھر میرا ایک تھیسز یہ بھی ہے کہ پاکستان کی ایک قومی زبان ایسی ہونی چاہیے جو اس کی چاروں علاقائی زبانوں کے مجموعے سے بنتی ہو کیونکہ صرف اسی ایک طریقے سے چاروں صوبوں کے عوام کو ایک دوسرے کے قریب لایا جا سکتا ہے اور انہیں ایک قوم کی صورت دی جا سکتی ہے جو اسے آج

تک حاصل نہیں ہو سکی اور جو کہ ہمارا بہت بڑا المیہ بھی ہے کیونکہ ہم نے دیکھ لیا ہے کہ صرف مذہب بھی ہمیں ایک قوم بنا سکنے میں کامیاب نہیں ہوا۔ جو دُوری مشرقی بنگال اور مغربی پاکستان میں اس حد تک پیدا ہوئی کہ ان دونوں طرف موجود تھا۔

ارژنگ: زبان کا رشتہ تو ہمارا انڈیا کے ساتھ بھی کافی حد تک موجود تھا۔ پھر ہمیں علیحدہ وطن کی ضرورت کیوں پیش آئی۔؟

ظفر اقبال: معاشی طور پر انہوں نے ہمارا جینا دشوار کر رکھا تھا اور آئندہ بھی کر سکتے تھے اور اپنی اکثریت کے بل بوتے پر ہمیں دبائے رکھنے کا شوق پورا کر سکتے تھے اور ہم سے سینکڑوں سال کی اس حکمرانی کا بدلہ لے سکتے تھے جو انگریزوں کے آنے سے پہلے ان کے تجربے میں آئی تھی اور بھی کئی عوامل ایسے تھے جن کی وجہ سے ہمیں ان سے الگ ہونا پڑا اور اس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ مذہب جو ہے اگر کئی معاملات میں فیصلہ کن حیثیت رکھتا ہے تو کئی معاملات اس کے دائرہ کار میں نہیں آتے اور جس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ہم صرف نام کے مسلمان رہ گئے ہیں ورنہ اگر ہم اندر اور باہر دونوں طرف سے مسلمان ہوتے تو ایک امت مسلمہ کی شکل اختیار کرتے ہوئے اس یگانگت اور یکجہتی کا مظاہرہ کرتے جو ہمارے ہاں مفقود نظر آتی ہے۔ زبان کا حوالہ یہاں عملی طور پر ظاہر ہوا ہے کہ ایک بلوچی، سندھی اور پختون، پنجابی نہیں جانتا اور اسی طرح پنجابی ان صوبوں کی زبان بول سکتے ہیں لکھ سکتے ہیں نہ سمجھ سکتے ہیں حالانکہ یہ صوبے ایک ہی ملک میں واقع ہیں۔ اس لحاظ سے بھی ضروری ہے کہ اگر ان علاقائی زبانوں کے فاصلے اتنے کم ہو جائیں کہ ایک یگانگت کا احساس پیدا ہو سکے تو ہماری قومی یکجہتی کا الجھا ہوا مسئلہ اس طرح حل ہو سکتا ہے۔

ارژنگ: تجربہ کرنے کے لیے کس قسم کی اہلیت درکار ہے؟

ظفر اقبال: اگر زبان کا تجربہ کر رہے ہیں تو آپ کو زبان پر خاصی حد تک عبور حاصل ہونا چاہیے یہ نہ ہو آپ زبان سے اپنی لاعلمی کو بہانے کے طور پر پیش کریں اگر آپ کو زبان پر قدرت حاصل نہیں ہے تو آپ کو اس کام میں ہرگز ہاتھ نہیں ڈالنا چاہیے کیونکہ اس کا نتیجہ ناکامی ہی ہو سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ جو تجربہ آپ کرنا چاہتے ہیں یا جو تبدیلی آپ لانا چاہتے ہیں۔ اس نظریے پر آپ کا مکمل ایمان بھی ہو تیسرے اس تجربے کو بروئے کار لانے کے لیے جس دلیری اور جرات کی ضرورت ہے وہ بھی آپ میں موجود ہو اور یہ تجربہ آپ اس بات سے بے پروا ہو کر کریں کہ دوسرے کیا کہیں گے یا یہ کہ وہ تجربہ کامیابی کا منہ دیکھتا ہے یا نہیں کیونکہ کسی تجربے کا ۵ فیصد کامیاب ہو جانا بھی اس کی کامیابی ہی کی دلیل ہے۔ حتیٰ کہ میں سمجھتا ہوں کہ اگر ایک تجربہ مکمل طور پر ناکام بھی ہو جاتا ہے تب بھی یہ ایسا ہے کہ اسے کیا جانا چاہیے اور تبدیلی کی کوشش مسلسل کرتے رہنا چاہیے۔ کیونکہ تازگی اور تبدیلی تجربے سے ہی میسر آ سکتی ہے بلکہ ایک قول جس کا میں حوالہ بھی دیا کرتا ہوں یہ ہے کہ کچھ نہ سوچنے سے غلط سوچنا بہر حال بہتر ہے اور میں اپنے ضمن میں یہ بات پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ میں اگر اب تک شعری ادب اور ادبی منظر پر موجود ہوں تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ میں نے ان تجربات سے خود فائدہ اٹھایا ہے۔ اگرچہ دوسروں کے لیے فائدہ اٹھانے کی دعوت بھی اس میں موجود تھی۔ لیکن اگر کسی نے فائدہ نہیں اٹھایا تو شاید اس لیے بھی کہ اس کام میں بہر حال خطرات مول لینے پڑتے ہیں اور اپنی بنی بنائی شناخت اور امیج کو داؤ پر لگانا پڑتا ہے جب کہ میرے اندر یہ جرات رندانہ تب بھی موجود تھی اور اب بھی اس میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ میں غلط ہو سکتا ہوں، لیکن جسے میں صحیح سمجھتا ہوں اسے ضرور کر گزرتا ہوں۔ اس سے میرے بڑے مخالفین وجود میں آئے لیکن اگر میں اس بات کا خیال کرتا تو شاید کبھی کچھ نہ کر سکتا اور اپنے ساتھ آغاز سفر کرنے والوں کی طرح ربع صدی پہلے سے ہی ایک قصہ پارینہ ہو کر شعری و ادبی ریٹائرمنٹ لے چکا ہوتا۔

ارژنگ: جیسا کہ آپ نے ابھی کہا، اگر آپ کو زبان پر قدرت حاصل نہیں تو آپ کو اس کام میں ہاتھ نہیں ڈالنا چاہیے کیونکہ اس کا نتیجہ ناکامی بھی ہو سکتا ہے، کیا ہم اس کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں، اس کا نتیجہ تجربہ بھی ہو سکتا ہے؟

ظفر اقبال: یہ دو کیٹگریز ہیں ایک تو یہ کہ آپ کو زبان پر قدرت حاصل ہو لیکن آپ اس میں تجربہ کرنے کی ضرورت محسوس نہ کریں دوسری یہ کہ زبان پہ قدرت حاصل ہونے کے باوجود آپ اس سے مطمئن نہ ہوں اور وہ آپ کے ساتھ چل نہ رہی ہو اور آپ سمجھ رہے ہوں کہ اس میں بنیادی تبدیلیاں کیے بغیر آپ اپنا تخلیقی سفر جاری نہیں رکھ سکتے تو پھر آپ کی یہ مجبوری بن جاتا ہے کہ آپ زبان کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کریں حسب ضرورت اس کی توڑ پھوڑ کریں اور بطور خاص شاعری میں ایسے طریقے سے استعمال کریں کہ جو دست زدہ از کار رفتہ اور روایتی نہ ہو اور آپ کے مزاج کے لگا کھاتا ہو اور آپ کے تخلیقی وفور کا ساتھ دے سکتا ہو۔

ارژنگ: اس طرح بیک وقت دو محاذ پر لڑائی سے کیا

تخلیقی قوت متاثر نہیں ہوگی؟

ظفر اقبال: اس طرح تجربہ آپ کی شخصیت کا حصہ بن جاتا ہے پھر کوئی تضاد باقی نہیں رہ جاتا بلکہ یہ تجربہ آپ کو نئی طاقت توانائی اور تازگی بخشتا ہے۔

ارژنگ: ہمعصر کالم نگاروں اور شاعروں میں سے کن سے متاثر ہیں۔ چند ایک نام ضرور لیں؟

ظفر اقبال: نہ میں کسی شاعر سے متاثر ہوا ہوں نہ کسی کالم نگار سے بلکہ میں شعر و ادب میں متاثر کرنے کا قائل ہی نہیں ہوں۔ نہ ہی میں اس ضمن میں کبھی استادی شاگردی کا روگ پالا ہے۔

ارژنگ: اپنے ایک انٹرویو میں آپ نے یہ بات کی کہ آپ نے اوکاڑا میں بیٹھ کر پاکستان کے دو بڑے ادبی گروپوں کا ناکوں چنے چبوائے کیا یہ بات درست ہے اور کیا یہ خود کو منوانے کا ایک طریقہ تو نہیں تھا؟

ظفر اقبال: اس میں مقصد تھا کہ ادب میں گروپ بازی یا دھڑے بندی ادب کو نقصان پہنچاتی ہے اور میں چونکہ بنیادی طور پر دھڑے بازی کے خلاف تھا اس لیے یہ دونوں دھڑے اور ان کے لیڈر بطور خاص میرا قدرتی ہدف بنتے تھے کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ اپنی شناخت بنانے اور اپنے مقام کو اونچا کرنے کے لیے ان دونوں دھڑوں نے ایک طرح سے اپنی اپنی آڑھت کھول رکھی تھی اور اپنے اپنے ادبی رسالے کے ذریعے یہ اپنی اپنی دوکانداری چمکانے کی کوشش کر رہے تھے اور ایک دوسرے کے خلاف افسوسناک حد تک صف آراء تھے اور ایک ادبی بدمزگی انہوں نے پیدا کر رکھی تھی جو آج بھی جاری و ساری ہے۔ چنانچہ میرے جیسے آدمی کا ان دھڑے بازوں کو آنکھیں دکھانا اور ان کو ان کی اصلی حیثیت سے آگاہ کرنا ضروری تھا۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ میں اس کام کے ذریعے اپنی پہچان بنانے کی کوشش کر رہا تھا تو یہ اس لیے غلط ہے کہ میں تو خود بہت بڑا خطرہ مول لے رہا تھا کیونکہ صورت حال یہ تھی اور کم و بیش اب تک بھی جاری و ساری ہے کہ پاکستان کا کوئی شاعر ادیب ان دونوں دھڑوں میں سے ایک کے ساتھ وابستہ ہوئے بغیر یا دونوں کشتیوں میں پاؤں رکھے بغیر یا دونوں دھڑوں کے بارے میں ایک منافقانہ مرنجاں مرنج رویہ اختیار کیے بغیر ادبی منظر پر زندہ نہیں رہ سکتا۔ مجھے ابتداء میں ان دونوں دھڑوں کی طرف سے ہمیشہ مثبت سلوک اور رویہ میسر آیا لیکن چونکہ ان کا کام غلط تھا جس کا حوالہ میں پہلے دے چکا ہوں۔ اس لیے میرے پاس ان دونوں کو مسترد کرنے کے علاوہ کوئی چارہ کار بھی نہیں تھا اور میں نے ان کی اس سیاست کا نا صرف ہمیشہ سے انکار کیا ہے بلکہ اس کے خلاف اپنی بساط کے مطابق صدائے احتجاج بھی بلند کی ہے اور بعض اوقات یہ ناگوار فرض بھی ادا کرنا پڑا ہے کہ تخلیقی اعتبار سے ان دونوں ادبی رہنماؤں کی اصل حیثیت کیا ہے کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتا رہا ہوں۔ جس کا کہ مجھے ہر طرح سے حق حاصل ہے اور جس طرح کہ ہر لکھنے والے کا ہر دوسرے لکھنے والے کے بارے میں رائے ظاہر کرنے کا استحقاق موجود ہوتا ہے۔ ورنہ مجھے الحمد اللہ ان کے ذاتی یا شخصی کردار سے کبھی دلچسپی نہیں رہی۔ اسی لیے میں ان کے فن کے بارے میں گفتگو کرنا زیادہ مناسب سمجھتا ہوں۔

ارژنگ: آپ اور آپ کے بعد کی نسل کے شاعر اسلم کولسری کے بعد اوکاڑہ کے ادبی منظر پہ کوئی قابل ذکر نام جس نے آپ کو متاثر کیا ہو؟

ظفر اقبال: اوکاڑا میں ایک دو شاعر ہیں مثلاً مسعود احمد اور جاوید اختر مانو وہاں پر دو جینوئن شاعر تخلیق شعر و ادب میں مصروف ہیں جن کی دو دو تین تین کتابیں بھی چھپ چکی ہیں۔ ان میں جاوید اختر مانو زیادہ جدید زیادہ جاندار اور زیادہ مزاحمتی ہے وہ نظم و نثر دونوں میں طبع آزمائی کرتا ہے اس نے شاعری کے علاوہ چند بہت اچھے افسانے بھی لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ ہمارے سینئر دوست اقبال صلاح الدین ہیں جو بیماری کی حالت میں بھی اپنے تخلیقی اور تحقیقی کام میں مصروف رہتے ہیں۔

ارژنگ: ادب کی ترقی و ترویج میں ادبی اخبارات و رسائل کے مدیران کا کیا کردار ہے اور کیا ان کی اس ادبی خدمت کے صلے میں حکومتی سطح پر اعتراف ہونا چاہیے؟

ظفر اقبال: ان کا بالکل حصہ ہے بلکہ میں نے اپنے ایک انٹرویو میں اوراق، اور فنون، دونوں کا حوالہ دیتے ہوئے ان کی خدمات کا اعتراف کیا تھا البتہ جو ادبی خبرنامے قسم کے اخبارات نکلتے ہیں ان کی اپنی ایک افادیت ہے اور شاعروں، ادیبوں کو ایک دوسرے کے ذاتی اور فنی معاملات سے آگاہ کرنے میں ان کا بڑا کردار ہے جو دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں اور انہوں نے ایک اچھے خاصے خلا کو پر کر رکھا ہو۔ تو جہاں تک ایوارڈز کا تعلق ہے تو یہ دینے والوں کا تعلق ہے کہ وہ کس کا ایوارڈ دیتے ہیں اور کس کا نہیں۔ البتہ یہ مدیران کرام چونکہ اپنی حیثیت میں مسلمہ طور پر شاعر یا ادیب بھی ہیں۔ اس حیثیت میں وہ ایوارڈ دینے والوں کی نگاہ انتخاب میں آسکتے ہیں اور کئی حضرات کو یہ ایوارڈز مل بھی چکے ہیں۔

❀❀❀

بقیہ انٹرویو ایوب صابر

فکاہیہ کالم 2009ء میں، "اذانِ سحر" شعری مجموعہ 2010ء میں، "نسخہ ہائے لطافت" فکاہیہ کالم 2011ء میں، "اسلاف کی دستک" شعری مجموعہ 2015ء میں شائع ہوئے۔ ان کے علاوہ کئی زیرِ تصنیف کتب ہیں جو منصۂ شہود پر آنے کی منتظر ہیں۔
ارم زہراء کے ارژنگ کے لئے کے لئے سوالات اور محمد ایوب صابر کے جوابات پیش ہیں۔

س: دورانِ تعلیم کس طرح کی سرگرمیوں میں حصہ لیتے تھے؟

ج: میرا دورانِ تعلیم ہی غیر نصابی سرگرمیوں کی جانب رجحان تھا۔ اسکول کے زمانے سے ہی ہفتہ وار بزمِ ادب میں حصہ لیتا تھا۔ اس کے علاوہ تقریری مقابلوں میں حصہ لیتا تھا۔

س: آپ نے اندر کے خوبصورت تخلیق کار کو کب دریافت کیا؟

ج: نئی صدی کی آمد پر میرے اندر کا تخلیق کار مجھے لکھنے کی جانب مائل کر رہا تھا۔ میں نے قلم پکڑا اور لکھنا شروع کر دیا۔ اس وقت اگر نہ لکھتا تو میرے اندر کی گھٹن میرے لئے جینا دشوار کر دیتی۔

س: ادبی حوالے سے آپ کے گھر کا ماحول کیسا تھا؟

ج: میری والدہ محترمہ پنجابی زبان میں معرفت کا کلام شوق سے پڑھتی تھیں۔ شاید شعر کی جانب مائل ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہی تھی۔ اس کے برعکس والد محترم کی طرف سے مجھے شاعری سے دور رہنے کی تلقین ہوتی تھی۔

س: پہلا شعر یا پہلا نثر پارہ کون سا لکھا۔ کیا یاد ہے؟

ج: میرا پہلا شعر۔ یہ نیا دور ہے کیسا آیا ہوا
اپنا سکہ ہے جس نے جمایا ہوا

دلاور فگار کے حالاتِ زندگی پر مضمون میری پہلی نثری تخلیق تھی۔ میری یہ خوش نصیبی ہے کہ ابتداء میں ہی میری شاعری اور نثر کو اہلِ نظر نے سراہا۔ اس کے بعد میں آگے بڑھتا گیا۔

س: آپ ایک عرصے سے سعودیہ میں مقیم ہیں۔ ادب کے حوالے سے یہاں کا ماحول کیسا ہے؟

ج: میں سعودیہ میں ادبی تقریبات میں نہ صرف شرکت کرتا ہوں بلکہ ہماری ادبی تنظیم "اوورسیز پاکستانی رائٹرز فورم" کے زیرِ اہتمام تقریبات کے انتظامات میں عملی طور پر شریک ہوتا ہوں، یہاں ادب کے حوالے سے کافی سنجیدہ کام ہو رہا ہے۔ مشاعروں سے لے کر ماہانہ نشست کا انتظام بہت دلجمعی سے کیا جاتا ہے۔

س: آپ شاعری میں کس شاعر کے متاثر ہیں؟

ج: میں زمانہ طالبعلمی سے ہی علامہ اقبالؒ کی شاعری اور فلسفے سے متاثر تھا۔ اس لئے جب لکھنا شروع کیا تو علامہ اقبال کا پیغام اور شعری رجحان میرے لئے مشعلِ راہ بن گیا۔ کالج دور میں کالج جاتے ہوئے میں روزانہ علامہ اقبال کے آبائی گھر "اقبال منزل" کے پاس سے گزرتا تھا۔ اس طرح میرے اور علامہ اقبال کے ساتھ قلبی لگاؤ ہو گیا۔

س: شاعری کے ساتھ مزاح نگاری کی طرف کیسے مائل ہوئے؟

ج: مزاح نگاری کی جانب بھی شاعری کی طرح اتفاق سے آ گیا۔ دراصل میرے کچھ دوستوں کا خیال تھا کہ میں مزاح نگار بن سکتا ہوں، ان کی خواہش پر ایک خاکہ لکھا اور پھر سعودی عرب سے اشاعت پذیر روزنامہ "اردو نیوز" نے دعوت دی۔ اس طرح یہ سلسلہ چل نکلا۔ اس کے لاہور سے اشاعت پذیر ماہنامہ "پاکٹ آئینہ" کے لئے فکاہیہ کالم لکھنا شروع کر دیا۔

س: اب آپ افسانے کی طرف راغب ہیں، یہ کیسے ہوا؟

ج: آج سے کوئی دو سال پہلے میں نے اپنی ماہانہ تنقیدی نشست میں ارم زہراء کا افسانہ "جنگل میں جمہوریت" تنقید کے لئے پیش کیا تو ایک شاعر دوست نے کہا کہ آپ کو اپنا افسانہ پیش کرنا چاہیے تھا۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ اپنا افسانہ کہاں سے لاؤں۔ اُس کے بعد میں نے نامور افسانہ نگاروں کے افسانے پڑھنے لگا پھر قلم اٹھایا اور افسانہ نویسی شروع کر دی۔ آج میرا پہلا افسانہ مجموعہ "آنگن کی خوشبو" مکمل ہو گیا جو 2016ء کے آخر میں انشاءاللہ شائع ہوگا۔

س: کیا اس کے بعد ناول کی طرف جانے کا بھی خیال ہے؟

ج: جی ہاں میں نے ناول کی ابتدا کر دی ہے۔ "تہذیب کی مسافت" کے نام سے ایک ناول تحریر کر رہا ہوں۔ جو تقسیم ہند کے بعد ہجرت کر کے پاکستان آنے والوں کے کرب کی کہانی ہے۔

س: آپ کو ابھی تک کون سے ایوارڈ ملے ہیں۔

ج: شعر و سخن ادبی ایوارڈ، اور حال ہی میں بھوپال این آئیز کی جانب سے "کیف بھوپالی ادبی ایوارڈ" دیا گیا ہے۔

س: اب تک کون کون سے اخبارات اور رسائل میں اشاعت پذیر ہو چکے ہیں؟

ج: جسارت سنڈے میگزین، زندگی سنڈے میگزین، ارژنگ، اردو نیوز، اردو پوسٹ، سرزمین، ہارٹ

لائن، پارلیمان نیوز، اردو میگزین، آواز، اخبار جہاں، ریشم، پائلٹ آئینہ، مڈویک ایکسپریس، نارتھ اسٹار، احساس، ارمغانِ ابتسام، شعروسخن، ٹیلنٹ انٹرنیشنل، مزاح پلس، رنگِ ادب، پکار انٹرنیشنل اور رابطہ میں میرا کلام اور مضامین اشاعت پذیر ہو چکے ہیں۔

س: کیا آپ کا کوئی انتخاب شائع ہوا ہے۔

ج: میرے اب تک "ہم صورت گر کچھ خوابوں کے، کچھ اپنے رنگ بکھرنے دو، گلستان، عہدِ بہادر شاہ ظفر سے عہدِ سعید الظفر تک" چار انتخاب شائع ہو چکے ہیں۔

س: فارغ وقت میں کیا مصروفیات ہوتی ہیں؟

ج: فارغ وقت بہت کم ملتا ہے۔ لکھنے پڑھنے سے ہی کم فرصت ملتی ہے۔ ویسے کبھی فرصت ہو تو ٹی وی پر کوئی ڈرامہ دیکھتا ہوں۔

س: ایک قلم کار کا معاشرے میں کیا کردار ہے؟

ج: قلم کار اپنے اردگرد جو کچھ دیکھتا ہے اسے ضبطِ تحریر میں لاتا ہے اس طرح یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ قلمکار معاشرے کی آنکھ ہوتا ہے۔ اس کا قلم اپنے دور کی گواہی دیتا ہے جس آئندہ نسلیں اُس دور کا سراغ لگاتی ہیں۔ قلمکار کا معاشرے کی تعمیر میں بہت کردار ہے۔

س: آپ ایک مزاحتی شاعر ہیں، اپنی شاعری کے نوجوانوں کو کیا پیغام دیتے ہیں؟

ج: میں نے اپنی شاعری کے ذریعے نوجوانوں کو عزتِ نفس اور اقدار کی پاسداری کا پیغام دیا ہے۔ ان کو اپنی پہچان برقرار رکھنے کی جانب مائل کیا ہے۔ اسلاف کی پیروی کا درس دیا ہے۔

س: آپ کے نزدیک ادب کا کیا مستقبل ہے؟

ج: ادب معاشرے کا حصہ ہے۔ کوئی بھی معاشرہ ادب کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس لئے میں پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ جب تک معاشرہ وجود میں ہے ادب زندہ رہے گا۔ ادب معاشرے کی اساس ہے۔

س: ادب برائے ادب یا ادب برائے زندگی۔ کس نظریے کے قائل ہیں؟

ج: جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ ادب معاشرے کی اساس ہے اس لئے ادب برائے ادب میرے نزدیک ایک نامکمل نظریہ ہے، ادب برائے زندگی ہی ادب کی اصل تشریح ہے۔ ادب کو زندگی سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ ادب کی بنیاد پر معاشرہ ارتقاء کی منزلیں طے کرتا ہے۔

س: ہماری نئی نسل جو شاعری کر رہی ہے، اس سے آپ مطمئن ہیں؟

ج: ادب کے معیار میں فرق تو ضرور آیا ہے اس کے باوجود نئی نسل ادب کے سائے میں چل رہی ہے۔ نوجوانوں میں کئی شعراء بہت پُر اثر شعر کہہ رہے ہیں۔ میرے خیال میں نئی نسل میں مطالعہ کا رجحان کم ہونا معیار میں کمی کی بنیادی وجہ ہے۔

س: ادب کے فروغ اور ترویج میں میڈیا کا کیا کردار ہے؟

ج: ہر دور کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ آج میڈیا کمرشل ہو گیا ہے اس کی وجہ سے ادب کے فروغ اور ترویج کی طرف وہ توجہ نہیں دی گئی جس کا ادب حقدار ہے۔ آج ذرائع ابلاغ نے تو بہت ترقی کر لی ہے لیکن ادب کو اس ترقی میں پوری طرح شامل نہیں کیا گیا البتہ سوشل میڈیا کے ذریعے ادب کافی حد تک فروغ پا رہا ہے۔

س: نئے شعراء اور ادباء کے نام کوئی پیغام؟

ج: میں ایک طالبعلم ہوں کیا پیغام دے سکتا ہوں۔ صرف اتنا کہوں گا کہ تن آسانی سے پہلو بچائیں۔ کوئی بھی کام شہرت کی خاطر مت کریں، آپ تخلیق پر توجہ مرکوز رکھیں۔ شہرت خود ہی آپ کو تلاش کر لے گی۔

دیے جلتے ہوئے امید کی اونچی منڈیروں پر
لیے پھرتی ہیں یہ شہزادیاں کوڑے کے ڈھیروں پر
کئی دل سوز چیخیں گھٹ کے رہ جائیں گی سینوں میں
لگے جب فصل کے میلے زمینداروں کے ڈیروں پر
کریں تو کیا کریں ہم اعتبارِ گردشِ دوراں
نظر ڈالیں تو کیا عکسِ شبِ ظلمت سویروں پر
خوشی کا ایک برپا ہے کہیں طوفان بے ہنگم
کہیں بارود کی بارش غریبوں کے بسیروں پر
کہاں ان کی جبینوں پر چمک رزقِ فراواں کی
ہمیشہ مہرباں دریا نہیں ہوتے مچھیروں پر
دکھائی دیں نہ شاید راستے اب رہ نوردوں کو
اجالے اب نہ شاید آ سکیں غالب اندھیروں پر
انہیں تو قتل پر بھی شہرتیں انعام ملتی ہیں
مؤثر ضابطے قانون کے ہیں کب وڈیروں پر

سرور ارمان

جب سے میرے یار دشمن ہو گئے
یہ در و دیوار دشمن ہو گئے
دیکھ کر خوشحال اک کم بخت کو
سب کے سب بیمار دشمن ہو گئے
اس کہانی کو بدلنا تھا مجھے
جس کے سب کردار دشمن ہو گئے
پھوٹ کر رونے لگا کھلتا گلاب
ساتھ مل کر خار، دشمن ہو گئے
غیر تو ہیں غیر ان کی چھوڑیئے
آپ بھی سرکار دشمن ہو گئے
ڈوبنے والوں کو تنکا مل گیا!
لگ گئے جب پار دشمن ہو گئے
ہو گئی خاموشیوں سے دوستی
صاحبِ گفتار دشمن ہو گئے
آخرت کی فکر کرنے پر مرے
یونہی دنیا دار دشمن ہو گئے

عمران شناور

مختصرادبی خبریں/تقریبات

مختصرادبی خبریں

☆ اشارہ انٹرنیشنل اسلام آباد کا دوسرا عالمی مشاعرہ اسلام آباد آبپارہ کمیونٹی کلب میں منعقد ہوا جس میں دنیا کے مختلف ممالک اور پاکستان سے شعرا نے شرکت کی۔ اس موقع پر سینئرز شعرا کو لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈز اور دیگر قابل قدر شعرا کو اشارہ انٹرنیشنل ایوارڈ بھی پیش کیے گئے۔ اشارہ کی انتظامیہ علی یاسر، جنید آزر شہباز چوہان اور اطہر مبارک باد کے مستحق ہیں۔

☆ محمد ادریس لاہوری (ناروے) اور ضمیر طالب (برطانیہ) کے اعزاز میں محفل مشاعرہ ایمبیسڈر ہوٹل لاہور میں منعقد ہوئی۔ صدارت خالد شریف نے کی۔ مہمان خصوصی اعتبار ساجد تھے۔ مہمان اعزاز علی اصغر عباس تھے۔ اس کا اہتمام لاہور کی تین معروف ادبی تنظیموں "پہچان انٹرنیشنل" (چیئرمین حسن عباسی)، "ادارہ خیال وفن" (صدر محمد ممتاز راشد لاہوری) اور "انٹرنیشنل رائٹرز کونسل" (چیئرپرسن ڈاکٹر عمرانہ مشتاق) نے مشترکہ طور پر کیا۔ شعراء نے بہت عمدہ کلام سنایا۔

☆ ممتاز شاعرہ اور افسانہ نویس آسناتھ کنول نے گزشتہ دنوں ایل ڈی اے فلیٹس میں کینیڈا سے تشریف لائے ہوئے نامور شاعر تسلیم الٰہی زلفی کے اعزاز میں ایک محفل مشاعرہ کا اہتمام کیا جس کی صدارت ڈاکٹر اجمل نیازی نے کی۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر شہناز مزمل، ڈاکٹر رضیہ اسماعیل اور تسلیم الٰہی زلفی تھے۔ جبکہ مہمانان اعزاز ڈاکٹر غافر شہزاد اور ابصار عبدالعلی تھے۔ شعرا کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔

☆ گلشن ادب کا سالانہ مشاعرہ ہمدرد سنٹر میں منعقد ہوا۔ جس میں ملک بھر سے شعرا کرام نے بھرپور شرکت کی۔ گلشن ادب کے روح ورواں عاشق راحیل گزشتہ کئی دہائیوں سے اس مشاعرے کا انعقاد باقاعدگی سے کر رہے ہیں۔ ہر ماہ یہ مشاعرہ اُن کی رہائش گاہ پر بھی باقاعدگی سے منعقد ہوتا ہے۔

☆ ادارۂ خیال وفن کے زیر اہتمام بچوں کے نامور ادیب نذیر انبالوی کے اعزاز میں اکادمی ادبیات لاہور میں اعزازی تقریب زیر صدارت ابصار عبدالعلی منعقد ہوئی۔

☆ نامور شاعر اعتبار ساجد کی مرتب کردہ کتاب "آپ تنہائی میں کبھی ملئے" (انتخاب کلیات ممتاز راشد) ماورا بکس لاہور سے شائع ہوگئی ہے۔

☆ سابق ڈسٹرکٹ آفیسر کالجز پاک پتن اور معروف شاعر سید جاوید حیدر ترمذی کا اولین شعری مجموعہ انور سنز پبلشر ساہیوال سے شائع ہوگیا ہے۔

☆ معروف شاعر، نقاد اور گورنمنٹ امامیہ ڈگری کالج ساہیوال میں تعینات اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اُردو پروفیسر عطاء الرحمٰن قاضی کو پاکستانی اردو غزل فکری و فنی تجربات ورجحانات کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ (1947 تا2004) کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی ڈگری دے دی گئی ہے۔

☆ شہر غزل ساہیوال کی فعال ادبی تنظیم "ادب سرائے" کا ماہانہ اجلاس شعری نشست کی صورت میں ہوا۔ اس اجلاس کی صدارت ڈاکٹر مرتضٰی ساجد نے کی۔ معروف نعت گو سیرت ایوارڈ یافتہ شاعر علی رضا مہمان خصوصی تھے۔

☆ اوکاڑہ میں مقیم نامور شاعر احمد جلیل کا چوتھا شعری مجموعہ "چاندنی کی بارش میں" شائع ہوگیا ہے۔

☆ نوجوان نسل کے مقبول شاعر احمد خیال کی تقریب پذیرائی الحمرا کلچرل کمپلیکس میں منعقد ہوئی۔ تقریب کی صدارت نامور شاعر غلام حسین ساجد نے کی۔ نظامت کے فرائض وقاص عزیز نے ادا کیے۔ اظہار خیال کرنے والوں میں علی اصغر عباس، حسین مجروح، حسیم صادق، نوید ملک، احمد حماد اور حسن عباسی کے نام نمایاں ہیں۔

☆ بزم باقی کی طرف سے دبئی میں مقیم معروف شاعر اختر ملک کے اعزاز میں ایک محفل مشاعرہ کا اہتمام پاک ٹی ہاؤس میں کیا گیا جس کی صدارت ملک کے نامور شاعر حسن عباسی نے مہمان خصوصی نعت گو اور سیرت ایوارڈ یافتہ شاعر علی رضا تھے۔ مہمانان اعزاز یاسین یاس اور کراچی سے آئے ہوئے شاعر اقبال تھے۔

☆ اٹلی میں مقیم شاعر نصیر ملک اور پیرس سے آئے ہوئے اور ایاز محمود ایاز کے اعزاز میں پہچان انٹرنیشنل کے چیئرمین حسن عباسی نے ایک تقریب کا اہتمام جس کی صدارت ناصر زیدی نے کی تقریب میں مہمان شعراء کے علاوہ لاہور کے معروف شعرا نے اپنا کلام پیش کیا۔

☆ کراچی سے تشریف لائے ہوئے شاعر سعید الظفر صدیقی اور رحیم یار خاں سے تشریف لائے ہوئے شاعر جبار واصف کے اعزاز میں ماورا انٹرنیشنل نے ایک محفل مشاعرہ کا انعقاد کیا۔ مہمان خصوصی توقیر احمد شریفی تھے۔ نظامت کے فرائض ماورا پبلشر کے روح و رواں اور معروف شاعر خالد شریف نے ادا کیے۔

☆ سعید جمال کے ناولوں کی تقریب پذیرائی رائل پام میں ہوئی جس میں نامور ادبی شخصیات نے شرکت کی صدارت ڈاکٹر مہدی حسن نے کی۔ اظہار خیال میں اوریا مقبول جان، ڈاکٹر عطا محمد عطا، فرحت پروین کے نام نمایاں ہیں۔ نظامت ریاض ہانس نے کی۔

تبصرۂ کتب/فلیپ/آراء

نام کتاب: یاحی یا قیوم/شاعر: ڈاکٹر غنی عاصم/صفحات: 128/قیمت: 300 روپے/تبصرہ نگار: ڈاکٹر طاہر تونسوی
ناشر: عظمی پبلی کیشنز، لاہور

ڈاکٹر غنی عاصم کے ہاں حمد خداوندی کی جو کہکشاں روشن ہے اور اسلوب و معنی کا ایک طلسم ہوشربا جلوہ فگن ہے اس کے ذہن کی ہنر مندی اور ہر نئے موضوع کے مطابق الفاظ کا جو چناؤ ہے وہ ان کے کمالِ ہنر کی آئینہ داری کرتا ہے اور میں دیانت داری سے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں سمجھتا کہ یہ حمدیہ مجموعہ اپنے لفظ و معنی دونوں اعتبار سے انوکھا بھی ہے اور نرالا بھی۔ اوران حمدیہ غزلوں کے چند اشعار کو چھوڑ کر ان میں جو صناعیت کا کمال دکھائی دیتا ہے اور جو عجزِ ہنر ہے وہ ڈاکٹر غنی عاصم کو غزل، نعت، منقبت اور سلام کی تخلیقی کائنات کے پس منظر میں حمدیہ شاعری میں بھی منفرد اسلوب و معنی کا شاعر بنا دیتا ہے۔ میں اس مجموعے کا کھلے دل اور بولتی آنکھوں سے سواگت کرتا ہوں۔

نام کتاب: تجلیاتِ رسالت ﷺ/مصنف: تفاخر محمود گوندل/صفحات: 415/قیمت: 800 روپے/تبصرہ نگار: مجیب الرحمٰن شامی
ناشر: ماورا بکس، 60-دی مال، لاہور

سیرت نگاروں کی سنہری زنجیر میں اب پروفیسر تفاخر محمود گوندل کے نامِ نامی کا اضافہ ہو گیا ہے۔ انھوں نے ایک اچھوتے انداز میں بارگاہِ رسالت مآب ﷺ میں باریابی کا شرف حاصل کیا ہے۔ وہ گلستانِ اردو کے قدیم باغبانوں کے وارث ہیں۔ لفظوں کے خوشبودار پھول چنتے، ان کے گلدستے بناتے اور بارگاہِ نبوتؐ میں پیش کر دیتے ہیں۔ انھیں پڑھتے ہوئے کبھی ابوالکلام آزاد یاد آتے، کبھی محمد حسین آزاد نظر میں سماتے اور کبھی آغا شورش لہراتے گنگناتے نظر آتے ہیں لیکن سچ پوچھیے تو ان کا اپنا تفاخر ہے۔ وہ خوشہ چین تو ہیں نقال نہیں ہیں۔ عمرے کی سعادت انھیں جس طرح حاصل ہوئی اور اس کے بعد انھوں نے "وارداتِ دل" کو جس طرح قلمبند کیا وہ اپنی جگہ ایک روح پرور کہانی ہے۔ اس روداد سفر کی قبولیت کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہو سکتا ہے کہ اس کے بعد "تجلیاتِ رسالت" ان کے حصے میں آ رہی ہے۔ اُمید ہے ان کی یہ تحریر شوق کی آنکھوں سے پڑھی جائے گی اور انھیں وہاں پہنچا دے گی جہاں پہنچنا ان کا استحقاق بن گیا ہے۔

نام کتاب: قلم، قرطاس اور قندیل/مصنف: محمود ظفر اقبال ہاشمی/صفحات: 288/قیمت: 700 روپے/تبصرہ نگار: خالد شریف
ناشر: ماورا بکس، 60-دی مال، لاہور

"سفید گلاب" اور "اندھیرے میں جگنو" کے بعد محمود ظفر اقبال ہاشمی کی جادوگر تحریر کا تیسرا معجزہ "قلم، قرطاس اور قندیل" آپ کے سامنے ہے۔ ہاشمی صاحب کی شخصیت میں جو مٹھاس، وسیع النظر فی اور نجابت ہے۔ وہ ان کی تحریروں میں چھپائے نہیں چھپتی۔ چنانچہ اس کا پرتو ان کے تخلیق کردہ کرداروں میں کہیں نہ کہیں ظاہر ہو ہی جاتا ہے۔ وہ خود ایک آئیڈیلسٹ ہیں اور دنیا میں "سب اچھا" دیکھنا اور سننا چاہتے ہیں۔ چنانچہ ان کی کہانیوں کے ہیرو بھی آئیڈیل شخصیت کے حامل ہوتے ہیں۔ یعنی جیسے ہونے چاہئیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ایسے کرداروں کا دنیا میں کوئی وجود نہیں ہوتا۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ دنیا کبھی کی ختم ہو گئی ہوتی۔ مگر ایسے کردار لاکھوں میں ایک یا خال خال ہی پائے جاتے ہیں مگر ہوتے ضرور ہیں کہ چاند کی مدھر چاندنی اور نسیمِ صبح کی تازگی انھی کے دم سے تو قائم ہے۔ خطاطی ہمارے فنونِ لطیفہ کی ایک ایسی صنف ہے جس کی جڑیں ہماری تہذیبی روایت میں بہت دور تک پیوست ہیں۔ اس مرتے ہوئے فن کی نبض پر محمود ہاشمی نے سچائی کا ہاتھ رکھا ہے۔ ریحان اور قندیل کے کرداروں کے تال میل سے وہ ایسا ماحول تخلیق کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں جس کی تمنا میں اہلِ فکر و نظر ازل سے دیدہ و دل کے چراغ بامِ اُمید پر رکھے ہوئے ہیں۔ ریحان اس معدوم ہوتی ہوئی نسل کا نمائندہ ہے جو ہمارے تحقیقی و تخلیقی ورثے کی امین ہے اور قندیل روشنی کی وہ کرن ہے جو اس گراں مایہ سرمائے کی حفاظت، بقا اور ترویج کے لیے خلاقِ ازل کی جانب سے مامور کی گئی ہے۔ "قلم، قرطاس اور قندیل" ایک مکمل ضابطۂ حیات کی جانب رہنمائی کرتے ہوئے اپنے قاری سے ہم آہنگی اور یک جہتی کا خواستگار ہے۔

نام کتاب:سفید گلاب/مصنف:محمود ظفر اقبال ہاشمی/صفحات: 224/ قیمت: 600روپے/تبصرہ نگار:اعتبار ساجد
ناشر: ماورا بکس،60-دی مال،لاہور

"سفید گلاب" مشرقی اور مغربی روایات کے تال میل سے جنم لینے والا ایک ایسا خوبصورت اور اصلاحی ناول ہے جو باب اوّل سے آخر تک قارئین کی دلچسپی برقرار رکھتا ہے۔ ہر چند کہ ایک وسیع ترین کینوس پر پھیلی ہوئی تصویر کائنات کے دو مختلف اور متضاد نظریہ زندگی کو بادی النظر میں سمیٹنا حد درجہ مشکل اور کٹھن کام ہے مگر محمود ظفر اقبال ہاشمی نے سہل زبان، خوبصورت الفاظ اور منظر کشی کی جذبات انگیز سحر کاری سے اسے اتنا دلچسپ بنا دیا ہے کہ ناول کے قارئین خود کو ہر منظر کا ایک حصہ سمجھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ لگتا ہے کہ مصنف قاری کا بازو پکڑے اسے اپنے ساتھ ساتھ لیے چل رہا ہو۔ کہیں بھی مصنوعی پن یا غیر ضروری لفاظی کا احساس نہیں ہوتا۔ فہد اور میری (مریم سلمان) کے کردار ہمارے ہی معاشرے کے دو زندہ جاوید کردار محسوس ہوتے ہیں۔ ان کی گفتگو میں رومان کی چاشنی کے ساتھ ساتھ حقائق کی گرہ کشائی کا عمل بھی نظر آتا ہے لیکن انتہائی مہارت اور پرکاری کے ساتھ۔ ہر چند کہ ناول نگار کی حیثیت سے محمود ظفر اقبال ہاشمی کی یہ پہلی کاوش ہے لیکن ان کی مہارت فن اور موضوع پر مضبوط گرفت دیکھ کر اندازہ نہیں ہوتا کہ یہ ان کا پہلا ناول ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ یقیناً اس فنکار نے قلم پر یہ دسترس یونہی حاصل نہیں کر لی بلکہ اس کے پیچھے برسوں کی ریاضت فن شامل ہے۔ بلاشبہ "سفید گلاب" کئی جہتوں اور معنوں میں بے حد خوبصورت، دل پذیر اور زندہ رہنے والی کہانی ہے۔ جو لوگ سفرناموں کی یک رنگی تحریروں سے اُکتا چکے ہوں انھیں یہ ناول ضرور پڑھنا چاہیے جس میں باہر کے شہروں کا ہی نہیں، دلوں، ذہنوں اور اندر کے شہروں کا احوال بھی تفصیل سے موجود ہے۔

نام کتاب:اعجاز سخن/مرتبہ:ڈاکٹر شہناز اعجاز جعفری/صفحات: 238/ قیمت: 200روپے/تبصرہ نگار:پروفیسر ڈاکٹر تبسم کاشمیری

زیر نظر مجموعے میں کچھ غزلیں بھی شامل ہیں۔ یہ کلاسیکی رنگ سخن کی غزلیں ہیں۔ وہ غزل کے کلاسیکی موضوعات سے دلچسپی رکھتے تھے۔ ان کی غزلوں کے اشعار پڑھ کر غزل کی پرانی مقبول روایت یاد آنے لگتی ہے۔ آخر میں یہ عرض کر دوں کہ اس مجموعے کو ہمدردی سے پڑھیے یہ ایک صاحب ذوق انسان کی سعی ہے۔ یہ روایت سے جڑا ہوا انسان ہے۔ اس نے جو کچھ لکھا ہے خلوص سے لکھا ہے۔

نام کتاب:طلسم خواب/شاعر:نوشاد قاصر/صفحات: 152/ قیمت: 250روپے/تبصرہ نگار:انوار فطرت
ناشر: ضوریز، اُردو مارکیٹ، ملتان

غزل میں خواب ناکی گزشتہ صدی کی ساتویں دہائی میں بھرپور آب و تاب کے ساتھ نمودار ہوئی۔ اس دہائی میں جہاں غزل نے اپنا رشتہ زمین، تاریخ اور اپنی مٹی سے مضبوط تر کیا، وہیں ماورائیت کا عنصر بھی اس میں چپکے سے در آیا۔ اس کے سب سے نمایاں شاعر ثروت حسین ہیں۔ اسی عہد میں اظہار الحق، خالد اقبال یاسر اور چند اور شاعروں نے بھی ایک طلسماتی تاریخی فضا تخلیق کر کے اردو غزل کو نئے لہجے اور طلسم سے مزین کیا۔ یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔
ہم صدیوں کے جگراتے مارے، جس ماحول میں زندگی کر رہے ہیں اس میں ہمیں کسی خواب خواب آسماں اور کسی نیند نیند زمین میں چند لمحوں کو پناہ مل جائے تو میں سمجھتا ہوں نعمت ہے۔ ملتان میں یہ کیف اور کنج ممتاز اطہر کے ہاں خاصی فراوانی سے ملتے ہیں اور ان کے تربیت یافتہ دوسوں نوشاد قاصر اور احمد رضوان کے ہاں بھی موجود ہیں۔ نوشاد کے ہاں البتہ وہ کیفیت بھی موجود ہے "جاگتے کو جو طلا دیوے ہے خواب کے ساتھ" (یہ موضوع ایک الگ مضمون کا متقاضی ہے)۔ ان اشعار کو پڑھیے اور دیکھیے کہ نوشاد قاصر نے آپ کے لیے کیسی کیسی دیو مالائیں تخلیق کی ہیں۔

نام کتاب:داستانِ اقبال/مصنفہ:آمنہ صدیقہ/صفحات: 128/ قیمت: 200روپے/تبصرہ نگار:تحسین فراقی
ناشر: القمر انٹرپرائزز، رحمٰن مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور

اسے بھی اقبال کے فکر و فن کی کرامت کہیے کہ وہ ایک مدت سے مختلف مکاتب فکر، اہل نظر اور عامۃ الناس سے احترام و عقیدت اور تقریر و تحریر کا خراج وصول کر رہے ہیں۔ اس کا آغاز تو ان کی زندگی ہی میں ہو گیا تھا۔ ان کی وفات کے بعد یہ عمل تسلسل کے ساتھ جاری ہے اور ذخیرۂ اقبالیات میں اضافہ روز افزوں ہے۔ گو کہ کیفیت میں کم، کمیت میں زیادہ احال ہی میں محترمہ آمنہ صدیقہ نے "داستانِ اقبال" کے زیر عنوان ایک کتاب تالیف کی ہے۔ یہ کتاب علما اور دانشوروں کے لیے نہیں، سیکھنے اور سمجھنے کے عمل میں پابہ جولاں ان طالبانِ علم کے لیے لکھی گئی ہے جنھیں اقبال نے اپنے پیغام کے ذریعے ہدف مائل اور بامراد زندگی گزارنے کے رنگ ڈھنگ بتائے اور ان کے لیے

پیہم، طوفان آشنا اور تلاطم ستیز و تلاطم خیز ہونے کی دعا کی۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ متعدد منابع سے استفادہ کر کے سلیس اور عام فہم زبان میں ایک ایسی کتاب لکھی جائے جس میں اختصار کے ساتھ اقبال کی زندگی اور ان کے حیات آفریں پیغام کے متعدد پہلوؤں کو سمو دیا گیا ہو۔ داستانِ اقبال اس ضرورت کو بخوبی پورا کرتی ہے۔ اُمید ہے کہ طلبہ و طالبات اور اقبالیات سے دلچسپی رکھنے والے عام قارئین اس تالیف سے استفادہ کریں گے اور یوں حیات و تعلیمات اقبال سے اچھا تعارف حاصل کر پائیں گے۔

نام کتاب: باقی سب خیریت ہے/ مصنف: امیر نواز نیازی/ صفحات: 336/ قیمت: 400 روپے/ تبصرہ نگار: سعد اللہ شاہ
ناشر: سعد پبلی کیشنز، لاہور

امیر نواز خاں نیازی کو شہرت تو ان کے مشہور عالم کالم "گر تو برا نہ مانے" سے ملی۔ مگر وہ ان چند کالم نگاروں میں شامل ہیں جن کی تحریر میں ادبیت بدرجہ اتم موجود ہوتی ہے۔ وہ بنیادی طور پر تخلیق کار ہیں۔ شگفتہ بیانی اور برجستہ اظہار ان کے اسلوب کی اساس ہے۔ انھیں شعر سے بھی اچھا خاصا شغف ہے۔ چونکہ وہ ایک اعلیٰ خاندان کے چشم و چراغ ہیں تو انھوں نے وراثت میں ایک سلیقہ، قرینہ اور شائستگی پائی ہے۔ وہ محکمہ جنگلات میں اعلیٰ عہدے پر رہے اور انھیں خوش قسمتی سے دنیا کے بڑے جنگلوں اور سیر گاہوں میں گھومنے کا موقع ملا۔ ان کی خداداد تخلیقی صلاحیت آخر کار انھیں صحافت و ادب کے خارزار میں لے آئی۔ یہی خار تو پھولوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ وہ موقر اخباروں میں قلم کے جوہر دکھاتے رہے۔ ان کی پہچان "گر تو برا نہ مانے" رہی اور اس کے بعد ان کی پے در پے آنے والی کتب جس میں 'کالم کلام'، 'گر تو برا نہ مانے'، 'گفتہ شگفتہ'، 'ساختہ بے ساختہ'، 'صبح دوام زندگی'، 'قلم کاریاں' اور موجودہ کتاب 'باقی سب خیریت ہے' شامل ہیں۔ ان کی نظر ساتھ نہیں دیتی اور ہاتھ میں بھی وہ جنبش اب نہیں مگر کہتے ہیں "رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے" وہ اب بھی لکھتے ہیں اور پھول کھلاتے ہیں۔ ان کے ہاں حب الوطنی، قرابت داری، دوست نوازی اور رشتوں ناتوں کا بھرم ان کی خوبصورت اور من موہنی سوچ کا غماض ہے۔ مختصراً یہ کہ وہ سب سے ٹوٹ کر محبت کرنے والے شخص ہیں۔ اللہ انھیں صحت کے ساتھ طویل عمر عطا کرے کہ وہ اسی کہکشاں کے ستارے ہیں جس سے ملک روشن ہے۔

نام کتاب: ترا کیا بنا/ شاعر: تیمور حسن تیمور/ صفحات: 167/ قیمت: 400 روپے/ تبصرہ نگار: ڈاکٹر خورشید رضوی
ناشر: التحریر، کبیر سٹریٹ اُردو بازار، لاہور

تیمور حسن تیمور کی ذات بصارت پر بصیرت کی برتری کا نقش اُستوار کرتی ہے۔ اس کی خود اعتمادی، حس مزاح اور آگے بڑھنے کا جذبہ ہمیشہ مجھے غیر معمولی دکھائی دیا۔ اُسے مشاعرہ لوٹتے دیکھ کر مجھے دلی خوشی ہوتی ہے مگر اس سے بھی زیادہ خوشی آج اس خیال سے ہو رہی ہے کہ تیمور کے کلام کا جادو اب مشاعرے تک محدود نہیں رہا بلکہ صفحہ قرطاس پر منتقل ہو کر زمان و مکاں کی قید سے آزاد ہو گیا ہے۔ خواب دیکھنے اور دکھانے کی قدرت اور ادھوری بات سے پورا مفہوم پیدا کرنا تیمور کے فنی خصائص میں شامل ہے۔ اُس کی شاعری میں احساس کی صداقت اور لہجے کی کاٹ اپنا لوہا منوا کر رہتی ہے۔ اس کے نہاں خانہ دل میں ایک کائناتی حزن ضرور بستا ہے مگر ذاتی سطح کا رونا دھونا اُس کے ہاں نہیں پایا جاتا ہے۔ زندگی کی طرف اُس کا رویہ نہایت مثبت ہے اور اس کی توجہ ہمیشہ گلاس کے نصف بھرے ہوئے حصے پر مرکوز رہتی ہے۔ کلام سہل، سبک اور برجستہ ہے جو چونکانے اور دل میں اُتر جانے کی صلاحیت سے مالا مال ہے اور اُس کے توانا تیور، جا بجا، ایک خوشگوار حیرت سے دوچار کرتے ہیں۔ تیمور کا شعر مستعار مضامین سے ہٹ کر اُس کے اپنے تجربات و احساسات کی آئینہ داری کرتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اس کی قریب قریب، ہر غزل میں ایک آدھ نشتر نکل ہی آتا ہے۔ غزل کے جادۂ پامال پر کوئی تازہ اور قابل شناخت نقش قدم ثبت کرنا آسان کام نہیں مگر تیمور نے کوئی دعویٰ کیے بغیر یہ کام کر دکھایا ہے۔ مجھے قوی اُمید ہے کہ تیمور کی شاعری دلچسپی سے پڑھی جائے گی اور اس کی ہر دل عزیزی میں مسلسل اضافہ ہوگا۔

نام کتاب: چاندنی کی بارش میں/ شاعر: احمد جلیل/ صفحات: 207/ قیمت: 400 روپے/ تبصرہ نگار: مسعود احمد

میرا اور احمد جلیل کا تعلق نصف صدی کے قصے سے زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ دو عشرے کم ہوا۔ اگر احمد جلیل اپنے ارد گرد کے حالات سے اتنا متفکر نہ ہوتا تو بہت بڑا مفکر بھی ہوتا۔ احمد جلیل کا یہ شعری مجموعہ غزلوں اور نظموں پر محیط ہے۔ بالخصوص ان کی منظومات بھرپور تاثر چھوڑتی ہیں۔ بسا اوقات ٹریلر دکھاتے ہوئے پوری فلم دکھا دی جاتی ہے جس کی وجہ سے ناظر کی فلم میں دلچسپی نہ ہونے کے برابر رہ جاتی ہے لیکن میں صرف ٹریلر تک محدود رہوں گا۔
جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کہ یہ کتاب کئی خوبصورت نظموں اور غزلوں کا مرقع ہے۔ اگر وہ بھی چن کر میں نے پیش کرنی ہیں تو پھر قاری کا کیا کام؟ لہٰذا یہ فریضہ میں آپ کو سونپتا ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ پیشہ ور نقاد اس کتاب کے بارے میں کیا رائے دیتے ہیں۔ اس صاحب کی طرح جنھوں نے بیرے کو چپاتیوں کا آرڈر دیا اور انھیں

خالی پلیٹ کے ساتھ لگا کر کھانا شروع کر دیا۔ کسی نے سوال کیا کہ آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟ خالی پلیٹ کے ساتھ نوالے لگا رہے ہیں۔ اُن صاحب نے جواب دیا میں ریاضی کا پروفیسر ہوں اور دال میں نے فرض کی ہوئی ہے۔ عہد حاضر کے نقادوں کو بھی دال فرض کرنی پڑتی ہے۔ جہاں ان کی دال نہیں گلتی تو وہ دال فرض کر لیتے ہیں اور صاحب کتاب پر چڑھ دوڑتے ہیں۔ آج کل آنے والی کتابوں کی شکلیں اور مضامین کو دیکھ کر اُلجھن ہوتی ہے کہ چینیوں کی شکل کی طرح سب کی سب ایک جیسی ہوتی ہیں مگر تیقن سے کہا جاسکتا ہے کہ یہ شعری مجموعہ اس زمرے میں نہیں آتا۔ کتاب پڑھ کر آپ بھی یقیناً میرے ہم نوا ہو جائیں گے۔

نام کتاب: عشق دھمال/ شاعر: اختر ہاشمی/ صفحات: 72/ قیمت: 100 روپے/ تبصرہ نگار پروفیسر ایرک
ناشر: نقش ہاشمی فاؤنڈیشن

اختر ہاشمی دی شاعری خالص عوامی شاعری اے۔ ایہدے پنجابی کلام نوں جے کر پنڈاں تے دیہاتاں وچ پڑھ کے سنایا جائے تے لہنوں عام مزدور تے کھیتاں وچ کم کرن والے ان پڑھ کسان وی آسانی نال سمجھ سکدے نیں۔ اختر ہاشمی دی شاعری نیں کسے وڈے شہر دے ہوٹل یا ریسٹورنٹ اندر جنم نہیں لیا۔ بلکہ ایہہ شاعری عوام وچ ای پیدا ہوئی، عوام وچ ای پروان چڑھی تے صرف عوام واسطے ای تخلیق کیتی گئی اے۔ جیہڑے شاعر یا ادیب عوام دے نال اپنا فکری تے احساسی رشتہ قائم رکھدے نیں اوہنوں توڑدے نیں۔ اوہناں دیاں تخلیقاں دا سورج کدے وی غروب نہیں ہوندا۔ اختر ہاشمی نے عوامی درد تے کرب نوں جس طرح محسوس کیتا اوہنے ایس نوں اپنی شاعری راہیں پورے خلوص اظہار نال لوکاں اگے پیش کرن دی پوری کوشش کیتی اے۔ جدوں ایہہ شاعر اسلامیہ کالج وچ پڑھدا سی میں اوہنوں اوہدوں دا جاندا واں، ایہہ کالج دا بیگ رائٹرز دا اک فعال رُکن سی، ایہدے اکثر دوست اوہنوں بیگ فائٹر کہندے سن پر حقیقت وچ اختر ہاشمی نہ صرف بیگ فائٹر سی بلکہ بیگ رائٹر وی اے۔ ایہہ ایس لئی پئی ایہہ اپنے کلام وچ عوام نوں ظلم تے جبر دے خلاف اک مٹھ ہو کے کھلون دی گل کرواے تے لوکاں اگے نصیحتاں دے رجسٹر کھول کے نہیں بہہ جاندا سگوں اوہناں نوں ویلے دیاں استحصالی قوتاں نال ٹکران دا حوصلہ بخش دا اے۔ ایہو جئی شاعری دا سورج کدے وی نہیں ڈُب سکدا۔

نام کتاب: پانی دی وار/ شاعر: اختر ہاشمی/ صفحات: 48/ قیمت: 100 روپے/ تبصرہ نگار: انوار قمر
ناشر: نقش ہاشمی فاؤنڈیشن

اختر ہاشمی اُردو تے پنجابی دے منے پرمنے شاعر تے ادیب نیں، تھوڑے جئے عرصے وچ اوہناں ادب تے ڈھیر سارا کم کیتا اے، اوہناں دیاں پنجابی شاعری دیاں دو کتابوں چھپ چکیاں نیں۔ ایس توں علاوہ افسانے، اردو غزلاں، ناول، کافیاں تے تنقیدی مضموناں دیاں کتاباں چھپن والیاں نیں۔ اجل کل دے ناشر ادیباں دا جو حشر کر دیں نیں اوہدے پاروں حالے تک نہیں چھپ سکیاں۔ پر اوہناں دی حوصلہ نہیں ہاریا، اوہناں نے حوصلہ اوہدوں دی نہیں سی ہاریا جدوں رب ولوں وارد ہوئے پانی دے ہڑھ نے ساری لوکائی نوں تباہ و برباد کر کے رکھ دتا سی، اوہناں دا حوصلہ انہاں ودھا اے، تے انہاں اگڑ کے سامنے اوندا اے پئی اوہڑھ دیاں تباہ کاریاں اگے کندھ بن کے کھلو جاندا اے۔ تسیں ایس نظم "پانی دی وار" توں اندازہ لا سکدے او پئی اوہ مایوسی دی تھاں تے حوصلے تے اُمید دے پیامبر دے روپ وچ ڈگے ڈھٹے معاشرے دی نویں سریوں تعمیر دا درس دیندے دکھائی دیندے نیں۔ میں سمجھنا واں ایس نظم دی سب توں وڈی خوبی ایہہ وے پئی وڈے توں وڈے ہڑھ تے وچ توں وڈے ظلم یا برائی اگے ہار نہیں منی چاہی دی۔ اوہدا پوری بہادری نال ڈٹ کے مقابلہ کرنا چاہی دا اے۔

نام کتاب: ہوا کا سمندر/ شاعر: فرخ راجا/ صفحات: 128/ قیمت: 250 روپے/ تبصرہ نگار: افتخار عارف
ناشر: پیلا پبلی کیشنز، اسلام آباد

کلاسیکی تہذیبی، علمی اور ادب روایت سے جڑے ہوئے عزیز دوست پروفیسر فرخ راجا کی پیش نظر کتاب "ہوا کا سمندر" ان کے تخلیقی سفر کا دوسرا قابل ذکر پڑاؤ ہے۔ اس سے قبل حمد و نعت و سلام و منقبت پر مشتمل ان کی کتاب "شجر طیب کے سائے میں" منصۂ شہود پر آ چکی ہے اور جہانِ حرف و ہنر کی طرف سے لائق اعتبار و امتیاز گردانی گئی ہے۔ صاحب دل، صاحب دانش، صاحب کردار درویش مزاج شاعر فرخ راجا، صغیر کے نامور بزرگ استاد شاعر حضرت جوہر نظامی مرحوم و مغفور کے فرزند ارجمند ہیں اور آستانِ جوہر سے نسبت فیض و شرف و استفادہ رکھتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کے کلام میں تازگی اور شادابی نمایاں ہے کہ یہ شاعری پرچھائیوں سے محفوظ اور تکرار کے عیب سے بچی ہوئی ہے۔ فرخ مضامین تازہ کی جستجو میں رہتے ہیں اور ان کے بیان میں بھی ندرت اور انفرادیت پائی جاتی ہے کہ وہ زبان کے تخلیقی استعمال کے تمام قرینوں اور سلیقوں سے پوری طرح واقف ہیں۔ اخلاص فن کے ساتھ انہماک نے ان کی شاعری کا ایک ایسا جہانِ معنی تشکیل کیا ہے، جو پڑھنے والے کو ان کے ادبی قد و قامت کا اعتراف کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

نامہ ہائے احباب

پیارے پیارے حسن عباسی صاحب

السلام علیکم۔ ارژنگ کے ٹائٹل کی جدت طرازیوں نے ایک سماں باندھ رکھا ہے۔ اس تناظر میں آپ اپنی سی کر دیکھتے ہیں۔ آپ نے میری غزل شائع کی خط کو بھی اہمیت دی۔ یہ کیا! غزل آصف صاقب (ص اق ب) کے نام سے چھپی ہے۔ یہ بھی کوئی جدت کا قرینہ ہوگا۔ خط کے ساتھ درست نام چھپا ہے آصف ثاقب۔ بہرطور آپ کی محبتیں مجھے حاصل ہیں۔ میں بہت خوش ہوں۔ حسن اختر خلیل کے خاکے سے دل بھر آیا ہے۔ فنون میں ایک ساتھ ہونے کی مجھے سعادت حاصل رہی ہے۔ احمد ندیم قاسمی انھیں فنون میں بھولے جی جان سے چھاپتے تھے۔ حمد ''سائیں'' بہت پسند کی جا رہی ہے۔ اب تو ''سائیں'' کتاب بھی آ گئی ہے۔ اسے دیکھنے کی ''خوش نصیبی'' بس یار احباب ہی کو ملی ہوگی۔ ارشد شاہین کے انٹرویو نے شاد آباد کیا۔ ارشد شاہین ''ناروے سپرد'' ہو چکے ہیں۔ 'بیاض' میں ان کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ خیر! جہاں بھی رہیں خوش رہیں۔ ''ارژنگ'' اپنے ''مزاج اور خیال'' کے اعتبار سے حسن آرا ہے۔ اس کا انتظار رہتا ہے۔

خیراندیش

آصف ثاقب/ بوئی ہزارہ

برادرم حسن عباسی صاحب!

کل تازہ ارژنگ ملا۔ بہت ممنون ہوں۔ سوچا بعد میں بھول نہ جاؤں ایک نظم اور دو غزلیں ارسالِ خدمت ہیں۔

مخلص/ جلیل عالی

جناب حسن عباسی صاحب!

السلام علیکم۔ اُمید ہے آپ معہ اہلِ خانہ خیریت سے ہوں گے۔ آمین

''ارژنگ'' حسبِ سابق باقاعدگی سے مل رہا ہے۔ جو آپ کی محبتوں اور چاہتوں کا ثبوت ہے۔

اس عنایت اور کرم فرمائی کا بہت بہت شکریہ

غزل برائے ''ارژنگ'' ارسالِ خدمت ہے۔

فقط

نصرت صدیقی/ فیصل آباد

مکرمی حسن عباسی!

سلام مسنون! آج کے دور میں ادب کے لیے آپ کا کردار باعث رشک ہے۔ میں ہمیشہ آپ کی کامیابی کے لیے دعا گو ہوں۔

''ارژنگ'' کے لیے چند تخلیقات ارسال کر رہا ہوں اُمید ہے پسند فرمائیں گے۔

مخلص

فرخ راجا

۱۱ اپریل ۲۰۱۳ء

جناب حسن عباسی صاحب!

آداب! اُمید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔ ''ارژنگ'' مل گیا۔ شکریہ اسوشل میڈیا نے تو ہر شے بہت قریب کر دی ہے۔ مگر خط لکھنے کی روایت اب ای میل میں ڈھلتی جاتی ہے کہ لوگ اب باقاعدہ قلم کاغذ لفافے کا تردد نہیں کرتے۔ شاید کچھ عرصے بعد میں بھی ایسے ہی کرنے لگوں مگر ابھی تک تو اس روایت سے چپکی ہوئی ہوں۔

آسناتھ کنول/ لاہور

عزیزم حسن عباسی!

کامیابیاں اور کامرانیاں سمیٹو۔ ارژنگ ملا اپنے نئے روپ کے ساتھ۔ وحید قندیل پہ لکھی گئی تحریر سامنے آئی تو اس خوبصورت محفل کی یاد تازہ ہو گئی جو اُن کے اعزاز میں آپ نے سجائی اور ہم سب کو اس کا حصہ بنایا۔ ''سائیں'' سے نوازا شکریہ۔

انشاء اللہ آپ کی فرمائش اور اپنے دل کی خواہش پر ضرور کچھ لکھوں گی۔

بہت دُعائیں

تسنیم کوثر

برادرم حسن عباسی!

اسلام علیکم۔ اُمید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔ آپ کی نوازش سے ''ارژنگ'' باقاعدہ ملتا رہتا ہے اور اس سے استفادہ حاصل ہوتا ہے۔ تازہ غزل پیشِ خدمت ہے جگہ دے کر شکریہ کا موقع دیجیے گا۔ آپ کو اور جناب تازاو کاڑوی صاحب کو پُرخلوص سلام و دعا

فقط خیراندیش

آفتاب خان

برادرِ محترم حسن عباسی!

اسلام علیکم۔ اُمید ہے آپ بخیریت ہوں گے۔ فون پہ بات ہوئی تھی۔ ارژنگ کے لیے کچھ چیزیں ارسالِ خدمت ہیں۔ شاملِ اشاعت کر لیجیے۔ فصیح نعتیں پر تبصرہ جس شمارے میں شائع ہوا تھا۔ وہ پرچہ ہمیں نہیں ملا۔ آپ نے کہا تھا کہ بھجوا دیں گے۔ یاد دہانی کرا رہا ہوں مل جائے تو بھجوا دیں۔ نوازش ہوگی۔

دُعا گو بھائی

ندیم نیازی

راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے زیر اہتمام مسلسل اشاعت کا 17 واں سال

عالمی سطح پر اردو ادب کا ترجمان

ماہنامہ

ارژنگ

لاہور

Monthly Arxang Lahore

پاکستان اور دنیا بھر کے اہل ادب کا ترجمان میگزین

اعلیٰ ادبی و صحافتی روایت کا امین

مدیر اعلیٰ ❀ عامر بن علی مدیر ❀ حسن عباسی

ادبی سلسلے

حمد و نعت

شاعری

افسانے

تبصرۂ کتب

سفرنامے

انشائیے

آپ بیتی

شعری گوشے

تراجم

نامہ ہائے احباب

تنقید و تحقیق

عالمی شاعری

طنز و مزاح

نامور ادبی شخصیات کے دلچسپ انٹرویوز

مختصر ادبی خبریں

ماہنامہ ارژنگ کے سالانہ ممبر بن کر ادب کے فروغ میں ہمارا ساتھ دیں

سالانہ ممبر شپ مع ڈاک خرچ مبلغ ایک 1000 روپے بیرونِ ملک 5000 روپے

ماہنامہ ارژنگ میں اشتہارات کی بکنگ کے نرخ

تفصیل	برائے ایک شمارہ	برائے تین شمارے	برائے چھ شمارے
مکمل صفحہ رنگین	5000 روپے	15000 روپے	30000 روپے
آدھا صفحہ رنگین	3000 روپے	9000 روپے	18000 روپے
مکمل صفحہ بلیک اینڈ وائٹ	3000 روپے	9000 روپے	18000 روپے
آدھا صفحہ بلیک اینڈ وائٹ	2000 روپے	6000 روپے	12000 روپے

ماہنامہ ارژنگ کی سالانہ ممبر شپ اور اشتہار کے لیے ابھی رابطہ کریں

0300-4489310-0331-4489310 nastalique786@gmail.com

دفتر: F/3 فیروز سنٹر غزنی اسٹریٹ اُردو بازار لاہور، 54000 پاکستان

حُسن اور حکومت سے کون جیت سکتا ہے
یہ بتاؤ دونوں کی عمر کتنی ہوتی ہے

ممتاز شاعر، کالم نویس، مترجم اور ماہنامہ "ارژنگ" کے مدیر اعلیٰ

عامر بن علی

کی کتب کے نئے ایڈیشن مکمل اہتمام کے ساتھ شائع ہو گئے ہیں

- چلو اقرار کرتے ہیں (شعری مجموعہ)
- سرگوشیاں (شعری مجموعہ)
- "محبت چھو گئی دل کو" (شعری مجموعہ)
- گفتگو (انٹرویوز)
- آج کا جاپان (کالم)
- محبت کے دو رنگ (تراجم)

نستعلیق Publications

غزنی سٹریٹ • اردو بازار • لاہور
0300-4489310 - 042-3751963
nastalique786@gmail.com

ناشر: حسن عباسی

اُس اجنبی سے ہاتھ ملانے کے واسطے
محفل میں سب سے ہاتھ ملانا پڑا مجھے

نامور شاعر اور سفرنامہ نگار حسن عباسی کی کتب

شعری مجموعے

- جگنو میری سوچوں کے
- ہم نے بھی محبت کی ہے
- ایک محبت کافی ہے
- اک شام تمہارے جیسی ہو
- سائیں (حمدیہ مجموعہ)

سفرنامے

- محبت کے پروں میں گھنٹیاں باندھو (بھارت)
- ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا (یو-اے-ای، دوحہ)
- تتلیاں ستاتی ہیں (یورپ)

اپنی کتاب کی بہترین اشاعت کے لیے رابطہ کریں

نستعلیق Publications

غزنی سٹریٹ • اردو بازار • لاہور
0300-4489310 - 042-3751963
nastalique786@gmail.com

ناشر: حسن عباسی

ادب معاشرے کا حصہ ہے۔ کوئی بھی معاشرہ ادب کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔

سعودی عرب میں مقیم نامور شاعر

محمد ایوب صابر

سے

ممتاز ادیبہ

ارم زہرا

کی گفتگو

تلاش و جستجو اور سعیِ وعمل کے تانے بانے سے بنے انسان کا نام محمد ایوب صابر ہے۔ حقیقتِ کائنات اور عرفانِ حق وصداقت کی آرزو اِن کے کلام میں پنہاں ہے۔ ان کی شاعری میں انسانی رشتوں کی پاسداری زندگی اور معاشرے سے گہری وابستگی اور کربِ حیات کے باوجود رجائیت اور حوصلہ مندی کا رویہ پوری توانائی کے ساتھ جھلکتا ہے۔ اسی لئے محمد ایوب صابر کی شاعری اور نثری تخلیقات نے ابتداء میں ہی شہرت کا انتخاب کرلیا۔ ان کے کلام میں کربِ ذات، خلشِ نارسائی اور امید کی روشنی نے اظہار کو گہرائی بخشی ہے اور اس خود غرضی اور افراتفری کے دور میں بھی انسان دوستی اور محبت کی شمع لے کر بازارِ سخن تک آگئے ہیں۔ محمد ایوب صابر اِس عہد کی ایک ایسی معتبر آواز ہیں جن کا اپنا ایک منفرد لب ولہجہ ہیں۔ شاعرِ مشرق علامہ اقبال کے شہر سے اِن کا تعلق ہے اور یہ خود بھی علامہ اقبال جیسا تخلیقی ذہن رکھتے ہیں۔ 6 ستمبر 1965ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے، موجودہ سکونت سعودی عرب میں ہے۔ آپ مشاعروں کی شان سمجھے جاتے ہیں بلکہ ہر ماہ ادبی نشست کا انعقاد بھی بھرپور انداز میں کرتے ہیں۔ اسی لئے متعدد نئے شعراء کو متعارف کرانے کا سہرا بھی آپ کے سر جاتا ہے۔ آپ کی شخصیت اور فن پر ایک دستاویزی فلم ''خوشبو کا سفر'' بن چکی ہے۔ مختلف ایوارڈز، شیلڈز اور میڈلز آپ حاصل کرچکے ہیں اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ آپ کی تخلیقات میں ''اعزاز کی قیمت''شعری مجموعہ 2006ء میں، ''دریچہ ءظرافت''

بقیہ اندرونی صفحات

میں زمانہ ء طالبعلمی سے ہی علامہ اقبال کی شاعری اور فلسفے سے متاثر تھا۔

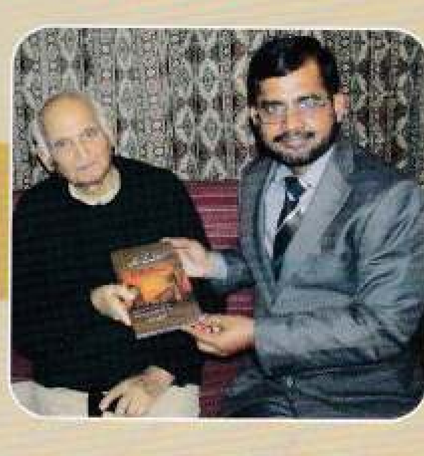

مقبول شاعر، منفرد کالم نویس اور مترجم عامر بن علی کی تمام تصانیف کے

''تازہ ایڈیشن'' شائع ہوگئے ہیں

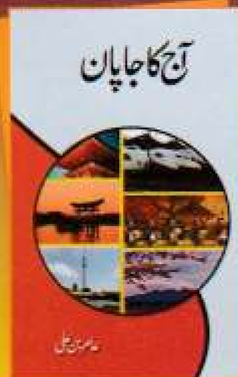

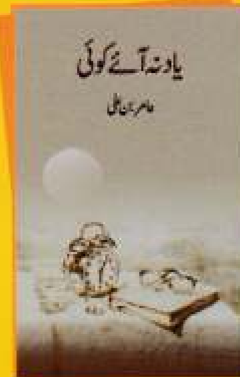

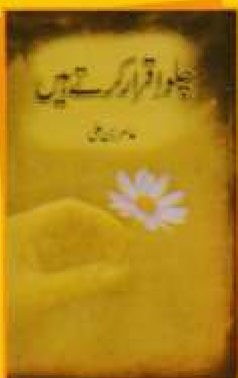

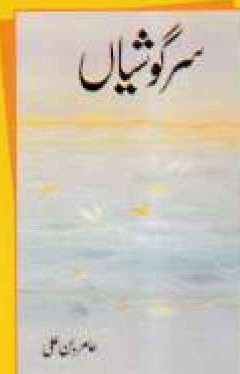

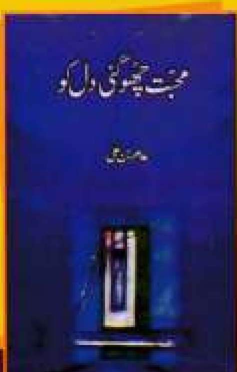

Amir Bin Ali is one of the finest Poets from younger generation that have emerged during last decade.
(Express Tribune Book Review)

Staying away from his homeland makes Amir Bin Ali skeptical that he might get disconnected from his past, it is evident from his poetry and prose that he loves his country a lot and want to stay connected. He is successfully doing so through his writings.
(Daily The Nation Book Review)

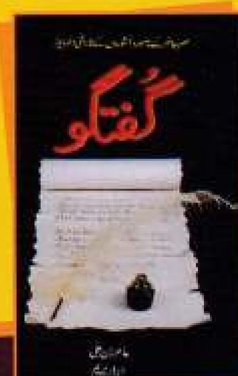

تفصیل کتب

● محبت چھوگئی دل کو (شعری مجموعہ) ● چلو اقرار کرتے ہیں (شعری مجموعہ) ● مکتوب جاپان (کالم)

● سرگوشیاں (شعری مجموعہ) ● آج کا جاپان (سفرنامہ) ● گفتگو (انٹرویوز) ● یاد نہ آئے کوئی

● محبت کے دو رنگ- گبریلا مسترال اور پابلو نرودا (ہسپانوی زبان سے براہِ راست اُردو میں کیے گئے تراجم)

Design By: 0300-4529821 MUHAMMAD AHSUN Gull

Read Arxang Online
www.amirbinali.com
www.millat.com